بسم الله الرحمن الرحیم

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ
لِلْإِسْلَٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ
عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ
مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ:

پس جب اللہ کسی کو ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سینہ کو اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے تو اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے جیسے کہ وہ زبردستی آسمان پر چڑھ رہا ہے (اس کی طرف اونچا ہو رہا ہے) اسی طرح اللہ ان لوگوں پر کثافت مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ یہ تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے آیتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

(سورہ انعام: آیات ۱۲۵، ۱۲۶)

اسلامی علوم و معارف اور علمی و ثقافتی افکار و عقائد کا ترجمان
شمارہ: ۲۵۱/ محرم-ربیع الاول ۱۴۴۲

ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
فون: ۳۴، ۲۳۳۸۳۲۳۲، ۳۳، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷
ichdelhi@gmail.com
http://newdelhi.icro.ir

مشاورین علمی

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر سید علی محمد نقوی

ادارتی بورڈ

پروفیسر سید اختر مہدی رضوی، ڈاکٹر حیدر رضا ضابط، ڈاکٹر علی رضا قزوہ

چیف ایڈیٹر	:	ڈاکٹر محمد علی ربانی
ایڈیٹر	:	پروفیسر سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی
جوائنٹ ایڈیٹر	:	ڈاکٹر خان محمد صادق جونپوری
ناظر اشاعت	:	حارث منصور
پریس	:	الفا آرٹ، نوئیڈا، یو۔پی۔

ISSN: ۲۳٤۹ – ۰۹٥۰

صرف غیر مطبوعہ مقالہ ہی ارسال فرمائیں۔
اگر ممکن ہو تو مقالہ، بذریعہ ای میل ichdelhi@gmail.com ارسال فرمائیں۔
مقالہ، ایران کلچر ہاؤس کے پتہ پر پوسٹ بھی کر سکتے ہیں۔
مقالہ کی اشاعت کے لئے ادارتی بورڈ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔
مقالہ نگار افراد کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

اداریہ		۱
اسلامی طرز زندگی کے عوامل	مؤلف: عیسیٰ عیسیٰ زادہ مترجم: ڈاکٹر محمد جعفر	۳
امام حسن عسکری کی انفرادی اور اجتماعی سیرت	مولانا حیدر رضا	۳۵
انسانی کرامت کے بنیادی اصول، ملا صدرا کی نظر میں	مؤلف: فتانہ درتاج مترجم: ڈاکٹر فیضان جعفر علی	۵۷
حضرت نظام الدین اولیا کی فقہی بصیرت	ڈاکٹر محمد اسامہ	۸۷
عرفان اسلامی میں مولانا رومی کا مقام	مولانا مہدی باقر خان	۱۰۱
شیعوں کی مذہبی اور سماجی بیداری میں خاندان اجتہاد کا مرکزی کردار	ڈاکٹر فیضان جعفر علی	۱۱۱

میر انیس کی مرثیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جعفر	۱۲۷
جدید مرثیہ اور اس کی خصوصیات	ڈاکٹر منتظر مہدی	۱۴۵

ادار یہ

اسلامی نقطہ نظر سے انسان اور اس کائنات کی خلقت عبث نہیں ہے بلکہ اس خلقت کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ کائنات کو حق کی بنیاد پر خلق کیا گیا ہے جس سے اس کا بامقصد ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کاروان ہستی ایک خاص مقصد و غایت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین کے درمیان موجود ہر شئے اللہ تعالی کی طرف رواں دواں ہے۔

جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ فنا نہیں ہوگا بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہو جائے گا تو اس کی زندگی میں احساس ذمہ داری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور اس کے اندر جینے کا سلیقہ آجاتا ہے اور عالم خلقت سے ہماہنگ ہوتے ہوئے زندگی کے اہداف و مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ دین اسلام انسان کی دنیاوی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے کچھ احکام و قوانین کو پیش کرکے اسے ہمیشہ باقی رہنے والی کامیابی کے لئے تیار کرتا ہے۔ اسلام ایک سماجی دین ہے اور کبھی بھی انسان کو رہبانیت اور معاشرہ سے الگ رہنے کی ترغیب نہیں دیتا۔ اسلام کا یہ ماننا ہے کہ انسان اس دنیا میں جو بھی بوئے گا وہی کاٹے گا۔ دین پر یقین رکھنے سے انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ذاتی منافع سے ہٹ کر معاشرہ اور دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچتا ہے اور انفاق و ایثار اور ظلم ستیزی کو اپنا وطیرہ بناتا ہے۔

فصلنامہ راہ اسلام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی افکار و آراء پر مشتمل اسلامی معارف اور دینی تعلیمات کو بہتر سے بہتر انداز میں قارئین کی خدمت میں پیش کرے تاکہ اسلامی اقدار و نظریات کے سایہ میں ہم سب مل کر ایک باوقار زندگی اور اچھے معاشرہ کی تعمیر کر سکیں۔

پہلے مقالہ میں ان عوامل و اسباب کو بیان کیا گیا ہے جن کو اپنانے سے انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کو اسلامی طرز زندگی کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔

ائمہ اطہار کی حیات طیبہ ہر دور کے انسانوں کے لئے ایک اسوہ حسنہ کے عنوان سے چراغ راہ ہے۔ اگلے مقالہ میں امام حسن عسکری (ع) کی انفرادی اور اجتماعی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے مقالہ میں انسانی کرامت اور شناخت کے سلسلہ میں ملا صدرا کے آراء و نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء ہندوستان کی روحانی، تہذیبی اور اسلامی تاریخ میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ اس سرزمین میں چشتیہ سلسلے کے چوتھے بڑے بزرگ اور اسی سلسلہ کی ایک شاخ "چشتیہ نظامیہ" کے بانی بھی ہیں۔ اگلے مقالہ میں ہم نے شیخ نظام الدین اولیا کی فقہی بصیرت پر روشنی ڈالی ہے۔

پانچویں مقالہ میں مولانا جلال الدین رومی کے عرفان و تصوف پر گفتگو ہوئی ہے۔

اگلے مقالہ میں ہندوستان اور خاص کر اودھ کے علاقے میں علمائے خاندان اجتہاد کی دینی بیداری کی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔

سید الشہدا حضرت امام حسین (ع) کی شہادت کا دین اسلام کی حقانیت کے اثبات اور جاودانگی میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ اس شہادت کی یاد کو زندہ رکھنا بھی اہم ہے اور مختلف زبانوں کے شعرا اور دانشوروں نے اپنی تخلیقات میں اس کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر انیس کا شمار بھی اردو زبان کے صف اول کے مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے امام حسین (ع) کی شہادت کو اپنے اشعار کے ذریعہ زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اگلے دو مقالوں میں سب سے پہلے میر انیس کے مراثی کی زبان، طرزِ ادا اور حقیقت نگاری کو بیان کیا گیا ہے اور پھر جدید مرثیہ کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔

گذشتہ شماروں کی طرح اس شمارہ میں بھی ہم نے مختلف دانشوروں کے رشحات قلم کو شامل کیا ہے۔ امید ہے کہ اس فصلنامہ کے مندرجات کا مطالعہ اور ان پر عمل، صالح اور دیندار معاشرہ کی تشکیل میں معاون ثابت ہوگا۔

ادارہ

اسلامی طرز زندگی کے عوامل

مؤلف: عیسیٰ عیسیٰ زادہ
مترجم: ڈاکٹر محمد جعفر

خلاصہ

ہر معاشرے کی طرز زندگی اس معاشرے کے باطنی عقائد اور اقدار کی علامت ہوا کرتی ہے اور وہ معاشرہ اسی وقت اپنے نتائج کو پا سکتا ہے جب اس کی طرز زندگی ان عقائد اور اقدار کے مطابق انجام پائے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ، زندگی کے دینی ہونے میں موثر عوامل سے محروم ہونے اور مغربی ثقافت کے اثر کو قبول کرنے کی وجہ سے دینی عقائد اور اپنی طرز زندگی کے مابین انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں ایک عمیق رابطہ برقرار نہیں کرسکا ہے۔ در حقیقت ہمارا معاشرہ، اسلامی طرز زندگی سے محروم ہو چکا ہے۔ باوجود اس کے کہ ثقافت سازی اور مناسب زندگی بسر کرنے کے طور طریقوں کے لئے مذہبی تعلیمات کا مطالعہ اور ان میں غور و فکر ان تعلیمات کی اعلیٰ استعداد وصلاحیت کو اجاگر کرتا ہے۔

اب اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ طرز زندگی کو مزید اسلامی بنانے کے لئے اس عظیم مذہبی استعداد و صلاحیت سے ہم کس طرح استفادہ کریں اور اس کا راہ حل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ان عوامل کی شناخت میں تلاش کیا جاسکتا ہے جو طرز زندگی کو قرآن ووحی کے معیار کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں طرز زندگی کے اسلامی ہونے میں موثر کردار ادا کرنے والے متعدد عوامل اور ان عوامل تک رسائی کے راستوں کی تحقیق کی جائے گی۔

مقدمہ

تمام انبیاء اور اولیائے الٰہی کا ایک اہم مقصد عقلانی اور الہامی تعلیمات کی بنیاد پر انسانوں کی طرز زندگی کی اصلاح کرنا تھا۔ اہم ہدف الٰہی احکام و قوانین پر مبنی ایک حکومت و فرمانروائی ہے کیونکہ الٰہی قوانین

پر مبنی ایک مضبوط حکومت صالح حکمرانوں اور قوانین نافذ کرنے والوں کے ذریعہ بہترین طریقہ سے الٰہی نمونوں پر مبنی زندگی گزارنے کے صحیح طریقے کو سماج و معاشرے میں پیش کر سکتی ہے۔

اب جب کہ اولیائے الٰہی کی صدیوں کی کاوشوں کے نتیجے میں حاکم ہو یا عوام سب پر فرض ہے کہ اعتقادی اصلاح و رشد کے ساتھ ساتھ طرز زندگی کو مذہبی تعلیمات کی بنیاد پر منظّم کریں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ہر قسم کے غیر مذہبی طور طریقے کو ختم کرنے کی کوشش کریں، وہ بھی اس صورت حال میں کہ مقام معظم رہبری کے قول کے مطابق اسلام اور ملتِ ایران کے دشمنوں کا ایک بنیادی مقصد لوگوں کے اخلاق و ثقافت، خاص کر ان کی طرز زندگی کو تبدیل کرنا ہے[۱]۔

اسلام و مسلمانوں کے دشمن آج کل کی ترقی یافتہ امکانات و سہولیات کے ذریعہ سے اسلامی معاشروں کے مذہبی عقائد کو نشانہ بنانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور عقائد کو کمزور کرکے غیر دینی طرز زندگی کو مسلمانوں کے درمیان حاکم بنانا چاہتے ہیں[۲]۔ لہٰذا اس ثقافتی اور تمدنی یلغار کا سامنا کرتے ہوئے ہر وہ چیز جو طرز زندگی کو مزید اسلامی بنانے میں مؤثر ہے اس پر ہر ایک کو غور و فکر کرنا چاہیے اور جو چیزیں طرز زندگی کی اسلامی تعلیمات سے جدائی کا سبب بنیں اور اسلامی ممالک میں غیروں کی تہذیب و ثقافت کے تسلط کا سبب بنیں ان سے گریز ضروری ہے۔ کیوں کہ ہر معاشرہ کی حقیقت، اس معاشرہ کی تہذیب و ثقافت ہے کہ جس میں ہر قسم کا انحراف دوسرے شعبوں کو بھی نیست و نابود کر دیتا ہے، اس حد تک کہ کسی بھی معاشرہ کی ثقافت میں معمولی سی تبدیلی طرز زندگی کو بھی آسانی سے بدل کر رکھ دیتی ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں تہذیب و ثقافت کا مؤثر ہونا اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ مقام معظم رہبری نے بھی بار بار دشمنوں کی جانب سے ہونے والی یلغار، یورش اور ثقافتی غارت گری کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ اسلامی معاشروں کی طرز زندگی میں اور خاص کر ہمارے عزیز ملک کی طرز زندگی میں غیروں کے ثقافتی اثر و رسوخ کی علامتوں اور نشانیوں کو دیکھ کر مقام معظم رہبری آیت اللہ خامنہ ای (حفظہ اللہ) نے سبھی لوگوں کو ان ثقافتی مشکلات سے نجات پانے کے طریقے بتا دیئے ہیں[۳]۔ اگر ان کی طرف توجہ کی جائے

۱۔ بیانات رہبری، ۱۳۹۴/۱۰/۱۴

۲۔ بیانات رہبری، ۱۳۸۰/۳/۲

۳۔ بیانات رہبری ۹۱/۷/۲۳

اور انہیں عملی جامہ پہنایا جائے تو بہت ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جو اپنے اور دوسروں کے لئے دین و دینداری کا درد رکھتے ہیں رہبر عزیز کی رہنمائی اور ان سنہری فرصتوں سے فائدہ اٹھا کر جو شہیدوں کے خون کی بدولت انہیں ملی ہیں، زندگی کے مختلف شعبوں کو مزید اسلامی بنانے میں مؤثر قدم اٹھا سکیں تاکہ الٰہی مدد کے ذریعہ جتنی جلدی ہو سکے اس منجی عالم کے ظہور کا زینہ فراہم ہو سکے جو دنیا کو عدل و انصاف سے پُر کرنے والا اور حیات دینے والا ہے تاکہ حقیقی معنی میں معاشرہ میں اسلامی طرز زندگی کو نافذ کیا جاسکے۔

تحقیق کے سوالات

۱۔ اسلامی طرز زندگی کا مطلب کیا ہے؟
۲۔ دینی تعلیمات اور طرز زندگی کے درمیان کون سا رابطہ پایا جاتا ہے؟
۳۔ طرز زندگی کے اسلامی ہونے میں سب سے اہم عوامل کیا کیا ہیں؟
۴۔ کیا قلبی عقائد اور ایمان کی بلندی طرز زندگی کے اسلامی ہونے میں مؤثر ثابت ہو گی؟
۵۔ قلبی عقائد کی بلندی اور تقویت کے کون کون سے راستے ہیں؟
۶۔ دینی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والے افراد کی طرز زندگی لوگوں کی طرز زندگی کے اسلامی ہونے میں کیا اثر رکھتی ہے؟
۷۔ کیا حکمرانوں اور معاشرہ کے عہدہ داروں کی طرز زندگی لوگوں کی طرز زندگی کے مزید اسلامی ہونے میں مؤثر ثابت ہو گی؟

طرز زندگی کا مفہوم

طرز زندگی کا ایک خاص نظام ہے جو ایک خاص شناخت کے ساتھ کسی فرد، کنبے یا معاشرہ سے وابستہ ہوتی ہے[۱]۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ طرز زندگی نسبتاً ایک ایسا معین راستہ ہے جس پر چل کر انسان اپنے مقاصد کا تعاقب کرتا ہے[۲]۔ اسلامی طرز زندگی ایک انفرادی اور سماجی طرز زندگی ہے جس پر اسلام

۱۔ شریفی، احمد حسین، ہمیشہ بہار، ص ۵۲۸، مہدوی کنی، محمد سعید، دین و سبک زندگی، ص ۷۶ و ۷۸
۲۔ کاویانی، محمد سبک زندگی اسلامی و ابزار سنجش آن، ص ۱۶

کے تمام کے تمام ماننے والے یا زیادہ تر مومنین یا اسلامی معاشرہ کا ایک با اثر گروہ عمل پیرا ہوتا ہے اور وہ ان کے طرز عمل میں نمایاں بھی ہوتا ہے[۱]۔

مقام معظم رہبری کہ جن کا فکری اضطراب ثقافتی مسائل، طرز زندگی اور لوگوں کے درمیان اسلامی زندگی کے نمونۂ عمل کو صحیح طریقہ سے بیان کرنا ہے، انہوں نے طرز زندگی کے بارے میں کچھ بیان فرمایا ہے جو دیکھا جائے تو ایک طرح سے طرز زندگی کی وہی تعریف ان کے نقطۂ نظر سے ہوگی:

معاشرتی رفتار و کردار اور طرز زندگی، زندگی کے بارے میں ہماری تفسیر و ترجمانی کے تابع ہیں، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر وہ مقصد جو ہم زندگی کے لئے طے کرتے ہیں اور اپنے لئے معین کرتے ہیں تو وہ ہمارے لئے طبیعی طور پر ایک طرز زندگی کی پیشکش کرتا ہے اور ایک اہم نظریہ جو پایا جاتا ہے وہ ایمان کا نظریہ ہے۔ ہمیں ایک مقصد معین کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس پر اعتماد کرنے کی کوشش کر سکیں۔ ایمان کے بغیر ان علاقوں میں ترقی ممکن نہیں ہے اور کام بھی صحیح طریقہ سے نہیں ہو پائے گا۔ اب رہی وہ چیز جس پر ہم ایمان و یقین رکھتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ لبرلزم ہو، کیپٹلزم ہو، یا کمیونزم ہو یا فاشیزم ہو۔ کسی ایک چیز پر تو ایمان و یقین رکھنا ہی پڑے گا اور اس ایمان و یقین کی پیروی بھی کرنی ہی پڑے گی ایمان کا مسئلہ بہت زیادہ اہم ہے ایک اصل پر ایمان، اور ایک اساسی بندرگاہ پر ایمان و یقین اس جیسے ایمان پر یقین کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ اسی ایمان کی بنیاد پر ہی طرز زندگی کا انتخاب کیا جائے گا[۲]۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ طرز زندگی سے مراد آداب و رسوم کی ترکیبی شکل ہے اس وضاحت کے ساتھ کہ جب لوگوں کی ظاہری نمائشوں اور ان کے روزمرہ کے رفتار و کردار کو مجموعی طور پر دیکھا جائے گا تو یہی ان کی طرز زندگی کو تحریر کر دے گا۔ مثال کے طور پر مصرف میں آنے والی چیزوں کا نمونہ، معاشرتی آداب، لباس پہننے کا طور طریقہ، زیب و زینت، غذا، رہائش گاہ، تفریح اور سفر، یہ سب کے سب لوگوں کی طرز زندگی کے ایک مکمل مجموعہ میں قرار پاتے ہیں۔ انسان کے اسی کردار و رفتار کی بنیاد پر اس کی بیرونی شخصیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس کے ماحول، عقاید، اقدار اور اس کی دلچسپیوں وغیرہ کا اندازہ اس کی انفرادی و سماجی زندگی میں دکھائی دیتا ہے۔[۳]

۱۔ مصباح، محمد تقی، سبک زندگی اسلامی، ضرورت ھا و کاستی ھا، ص ۶
۲۔ بیانات رہبری، ۹۱/۷/۲۳
۳۔ حسین زادہ، علی، سبک زندگی، ص ۲۱

طرز زندگی، دینی تعلیمات کے سایہ میں

اسلامی تعلیمات کا بار بار مطالعہ کرنے سے اور ان میں بار بار غور و فکر کرنے سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات، تمدن سازی اور مناسب طرز عمل کے سلسلہ سے نمونۂ عمل پیش کرنے میں اعلیٰ استعداد و صلاحیت کی حامل ہے کیونکہ طرز زندگی، اسلامی نظام کے سانچے میں جگہ بنا چکی ہے اور انسانی تکامل و سعادت کی راہ میں اس سے استفادہ کیا جانے لگا ہے۔

قرآن کریم جو اسلامی تعلیمات کا سب سے اہم منبع و ماخذ شمار کیا جاتا ہے، وہ ایسے نمونوں سے بھرا پڑا ہے کہ جو انسان کو مومن کی طرح جینے کے طریقے اور اسلامی نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کے طور طریقوں سے باخبر کرتے ہیں۔ قرآنی آیات کی روشنی میں زندگی کے عالی نمونے اور اسوۂ عمل کی حیثیت سے حضرت نبی اکرمؐ کی سیرت کا بھی تمام مسلمانوں سے تعارف کرایا گیا ہے۔

اسی طرح اہل بیتؑ کی بہت ساری روایات بھی مسلم معاشروں کو دستیاب ہیں کہ جن روایات میں ان ہستیوں نے قرآن کریم کی نورانی تعلیمات سے استنباط کرتے ہوئے معاشرے کے مختلف حالات و مراحل میں دینی، مذہبی زندگی بسر کرنے والے نمونۂ عمل کے کئی مصادیق کو بیان فرمایا ہے اور ان کا تعارف کرایا ہے۔ بالخصوص بعض وہ تاریخی ادوار جو خاص طور پر ثقافتی، معاشرتی، سیاسی اور علمی امتیازات کے لحاظ سے ہمارے زمانے کے لیے یعنی اسلامی معاشرے کے لیے ایک بار پھر ایسا دور مہیا کر رہا ہے جو دستیابی کے لحاظ سے بہت اہم نتائج مہیا کرا سکتا ہے[۱]۔

یقیناً ہماری زندگی کی حقیقت اب بھی اس چیز سے کہیں زیادہ دور ہے جس کا اسلام نے ہم سے مطالبہ کیا ہے لیکن اسلامی نظام کی کوشش ہے کہ اس فاصلہ کو ختم کر دے"[۲]۔ رہبر معظم آقای خامنہ ای نے توحید کے معنی کو بیان کرتے ہوئے اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

۱۔ فاضل، قانع، سبک زندگی، ضرورت ھا و راہبر دھا، ص ۳۴۔۴۱

۲۔ بیانات رہبری: ۱۳۸۰/۳/۲۰

"نبی اکرمؐ کی بعثت کا پہلا مقصد توحید الٰہی کی طرف بلانا تھا لیکن توحید صرف ایک فلسفی اور فکری نظریہ نہیں ہے بلکہ توحید انسانوں کو زندگی بسر کرنے کا طریقہ و سلیقہ سکھاتی ہے"[۱]۔

آیت اللہ خامنہ ای (حفظ اللہ) نے معاشرتی زندگی اور اسلام کے دوسرے شعبوں میں مسلمانوں کے فرائض کو معین کرتے ہوئے فرمایا:

"اسلام نے معاشرتی زندگی میں، انفرادی زندگی کی کیفیت کے بارے میں کھانے پینے، لباس پہننے اور پڑھنے لکھنے کے بارے میں، حکومتی تعلقات و روابط میں ایک دوسرے کے آپسی تعلقات و روابط اور ان کے معاملات کے بارے میں، مسلمانوں کے وظائف کو معین کیا ہے"۔[۲]

خداوند عالم نے بھی انسانوں کو بہترین طرز زندگی تک آسانی کے ساتھ پہنچنے کے لئے نبی اکرمؐ کی طرز زندگی اور عملی زندگی کو اسوۂ حسنہ کے طور پر انسانوں کے اختیار میں قرار دیا ہے اور سبھی کو ان کی پیروی اور اطاعت کا حکم دیا ہے:

لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا۔ ترجمہ: بے شک تمہارے لئے پیغمبرِ اسلام کی ذات میں (پیروی کیلئے) بہترین نمونہ موجود ہے۔ ہر اس شخص کیلئے جو اللہ (کی بارگاہ میں حاضری) اور قیامت (کے آنے) کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہے۔[۳]

وہ عوامل جو زندگی کے طور طریقہ کو اسلامی بنانے میں مؤثر ہیں:

مختلف قسم کے عوامل، زندگی کے طور طریقہ کو اسلامی بنانے میں مؤثر ہیں لیکن ان میں سے بعض

۱۔ بیانات رہبری: ۱۳۸۲/۷/۲

۲۔ بیانات رہبری: ۱۳۶۹/۱۰/۱

۳۔ سورہ احزاب، آیت ۲۱

بہت ہی قطعی اور یقینی اثر رکھتے ہیں اس مضمون میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان تین عوامل و اسباب کے بارے میں تحقیق کی جائے جو انسانی رفتار و کردار میں اثر رکھتے ہیں اور دینی تعلیمات میں بھی ان کی جانب ایک خاص توجہ دی گئی ہے۔

ا۔ قلبی عقائد اور ایمان کو مضبوط بنانا

افراد اور معاشروں کی زندگی کا طور طریقہ ان کے ایمان اور عقائد کے معیار کی علامت ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم اس مطلب کی تائید میں ارشاد فرماتا ہے:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ۔ ترجمہ: اور جو زمین عمدہ و پاکیزہ ہوتی ہے خدا کے حکم سے اس کی نبات (پیداوار) خوب نکلتی ہے اور جو خراب اور ناکارہ ہوتی ہے تو اس کی پیداوار بھی خراب اور بہت کم نکلتی ہے ہم اسی طرح شکر گزار قوم کے لیے اپنی نشانیاں الٹ پھیر کر بیان کرتے ہیں۔[1]

انسانی رفتار و کردار خود اپنے قلبی عقائد سے متاثر ہوتے ہیں لہٰذا ان کے طرز عمل کے ذریعہ سے ان کے ایمان کے معیار کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

فَبِالْإِيْمَانِ يُسْتَدَلُّ عَلَى الصَّالِحَاتِ وَ بِالصَّالِحَاتِ يُسْتَدَلُّ عَلَى الْإِيْمَانِ۔ ترجمہ: ایمان کے ذریعہ نیکیوں کے وجود پر دلیل لائی جاسکتی ہے اور نیکیوں کے ذریعہ سے بھی ایمان کے وجود پر دلیل لائی جاسکتی ہے۔[2]

حضرت امام جعفر صادقؑ بھی ظاہری اور باطنی روابط کے بارے میں اور ظاہری رفتار میں باطنی عقائد کے مؤثر ہونے کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

ا۔ سورہ اعراف، آیت ۵۸

۲۔ شریف رضی، محمد بن حسین، نہج البلاغہ، ص ۱۵۵

"ظاہر کا آلودہ ہونا باطن کی آلودگی کی وجہ سے ہے جو بھی اپنے باطن کو پاک کرتا ہے تو خدا اس کے ظاہر کو پاک کر دیتا ہے اور جو شخص باطن میں خدا کا خوف رکھتا ہے تو خدا ظاہر میں اسے ذلیل و رسوا نہیں کرتا لیکن جو پوشیدہ طور پر خدا سے خیانت کرتا ہے تو خداوند متعال بھی ظاہر میں ذلیل اور بے عزت کر دیتا ہے۔"[۱]

یہ توجہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ اعمال و رفتار اسی وقت لوگوں کے ایمان اور باطنی عقائد کو آشکار کر سکتے ہیں اور وہ اعمال و رفتار باطنی عقائد کی پیمائش کا ترازو بن سکتے ہیں جب وہ عمل متعدد حالات میں اور مسلسل ان سے صادر ہوتے رہے ہوں ورنہ ایک مرتبہ عمل انجام دینے سے انسان کے ایمان اور اس کے باطنی اعتقاد کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عمل خاص شرائط میں اتفاقی طور پر اس سے صادر ہو گیا ہو۔ لہٰذا اگر کسی شخص کا رفتار و کردار اور اس کے زندگی بسر کرنے کا طور طریقہ ایمان و دینداری کے اظہار کے باوجود اس کے مذہبی ایمان و عقائد کے مطابق نہ ہو تو یہ اس کے گذشتہ عقائد کی کمزوری کی وجہ سے ہوگا۔

اس حقیقت کی تائید میں حضرت امام حسینؑ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے:

اِنَّ النَّاسَ عَبِيْدُ الدُّنْيَا وَالدِّيْنُ لَعْقٌ عَلَىٰ اَلْسِنَتِهِمْ يَحُوْطُوْنَهٗ مَا دَرَّتْ مَعَائِشُهُمْ فَاِذَا مُحِّصُوْا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّيَّانُوْنَ۔ ترجمہ: یقیناً لوگ دنیا کے غلام ہیں اور دین ان کی زبان پر گوشت کے ایک ٹکڑے کے مانند ہے۔ جب تک ان کی زندگی تقاضا کرتی ہے وہ اسے اپنے دہن میں گھماتے رہتے ہیں لیکن جب بلاؤں اور مصیبتوں کے ذریعہ انہیں آزمایا جاتا ہے تو حقیقی دیندار کم ہی بچتے ہیں۔[۲]

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ پختہ ایمان و یقین رفتار و کردار میں مؤثر ہے جب ایک گنہگار انسان امام حسینؑ کی طرف رجوع کرتا ہے اور گناہوں کو ترک کرنے کے لئے امام حسینؑ سے راہ تدبیر

۱۔ مصطفوی، حسن، مصباح الشریعہ، ص ۱۰۷

۲۔ ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی، تحف العقول، ص ۲۴۵

دریافت کرتا ہے تو امام علیہ السلام اسے اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اور خداوند عالم اور روز قیامت کے بارے میں اس کے عقیدے کو مستحکم بناتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"پانچ چیزوں کو انجام دو پھر جو گناہ چاہے انجام دو۔ ا۔ خدا کا رزق نہ کھاؤ جو گناہ چاہو انجام دو۔ ۲۔ خدا کی سلطنت و مملکت سے نکل جاؤ اور جو گناہ چاہو انجام دو۔ ۳۔ اس جگہ چلے جاؤ جہاں پر خدا تمہیں نہ دیکھے اور جو گناہ چاہو انجام دو۔ ۴۔ جس وقت ملک الموت تمہاری روح قبض کرنے کے لئے آئے تو تم اسے خود سے دور کردو اور جو گناہ چاہو انجام دو۔ ۵۔ اور جس وقت مالک دوزخ تمہیں آتش جہنم میں ڈالے تو اس میں نہ جاؤ اور جو گناہ چاہو انجام دو"۔[۱]

حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی اس نصیحت میں غور و فکر کے ذریعہ سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ زندگی میں رفتار و کردار کے راہ و روش کی اصلاح و تبدیلی اور اسے دینی تعلیمات کی طرف لے جانے کا سب سے اہم ذریعہ خداوند عالم اس کے توحیدی صفات اور عالم قیامت کے وجود کے بارے میں قلبی عقائد کو مضبوط بناتا ہے۔ یعنی اگر خداوند عالم اس کے توحیدی صفات اور عالم قیامت کے وجود پر کسی کو پختہ ایمان و یقین ہو تو اس کے طرز عمل میں تبدیلی آئے گی اور اس کا طرز عمل مذہبی تعلیمات کے مطابق ہوگا۔

علامہ طباطبائیؒ نے بھی سورۂ ابراہیم کی ۲۴ویں آیت کے ذیل میں طرز عمل پر عقائد کے اثر و رسوخ کے بارے میں کچھ اس طرح فرمایا ہے:

"حقیقی عقائد نیک اعمال کے وجود میں آنے اور اچھے اخلاق کے نشو و نما کا سبب بنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی معاشروں میں جو مختلف طرز عمل پائے جاتے ہیں ان کی اصل وجہ مختلف مذاہب کا وجود ہے اور انسانی معاشروں میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طور طریقہ بھی کائنات کی حقیقت کے بارے میں ان کے مختلف عقائد اور نظریات کی وجہ سے ہی پیدا ہوئے ہیں"۔[۲]

ا۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار (ج ۷۸) ص ۱۲۶

۲۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن (ج ۱۶)، ص ۲۰۰۔۲۰۱

شہید مطہریؒ بھی انسانی طرز زندگی پر ایمان کے اثر و رسوخ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"جس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ صرف ایمان ہی میں وہ قدرت پائی جاتی ہے جو انسان کو حقیقی انسان بنا سکتا ہے اور خود پسندی کو عقائد و مذہب کے ماتحت قرار دے سکتا ہے اور انسان میں طاعت و بندگی کی ایک کیفیت کو ایجاد کر سکتا ہے اس طرح سے چھوٹے سے چھوٹا وہ مسئلہ جسے مکتب اسلام پیش کرتا ہے وہ اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کرتا بلکہ وہ مسئلہ اس کے لئے اس قدر محبوب اور بیش قیمت ہوتا ہے کہ جس کے بغیر اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے"۔[1]

طرز زندگی میں ایمان کے اثر و رسوخ کے مختلف پہلو

ایمان اور قلبی عقائد انسانی طرز عمل میں سب سے قوی اور مؤثر عوامل ہیں۔ پختہ عقائد، طرز زندگی میں اہم اور قطعی تبدیلیاں لاتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ انفرادی، معاشرتی شعبوں میں اور یہاں تک کہ ماحول میں بھی بہت سارے آثار کے جلوہ گر ہونے کا سرچشمہ قرار پائیں کیوں کہ خدا، وحی و رسالت اور قیامت پر ایمان، جہان ہستی اور تمام موجودات عالم (منجملہ خود انسان کے وجودی فلسفہ) کے بارے میں انسانی نظریات میں تبدیلی کا سبب بنے (جو شخص خدا، وحی و رسالت اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کا کائنات کے بارے میں نظریہ اور کائنات کے تمام موجودات کے بارے میں غیر مومن کے نظریات سے مختلف ہوتا ہے وہ تمام چیزوں کی تخلیق کو مقصد و حکمت کے طور پر دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر ایک چیز مقصد کے تحت خلق ہوئی ہے)۔

یہ نظریہ کی تبدیلی ہی ہے جو انسانی زندگی کے مقاصد کو معین کرنے کی راہ ہموار کرتی ہے کہ جس کے نتیجہ میں وہ معین مقصد، انسانی روابط کو خود انسان کے ساتھ، خدا کے ساتھ، دوسروں کے ساتھ اور حالات کے ساتھ مشخص کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ لوگ سچے مومن اور پابند عقیدہ ہیں اگر ان کی زندگی کے بارے میں تحقیق کی جائے تو ان کی زندگی کے تمام میدان میں یہاں تک کہ ان کی زندگی کے جزئی مسائل

۱۔ مطہری، مرتضیٰ، مجموعہ آثار (ج ۲) ص ۴۱ و ۴۲

میں بھی ایمان کے آثار و برکات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ زندگی گزارنے کے طور طریقوں کے بارے میں خدا اور اس کے اولیاء کی تمام نصیحتوں کے حکمت آمیز ہونے پر سچا ایمان و یقین، سکون قلب کا سبب ہے اس لئے کہ مومن جانتا ہے کہ خدا اور اس کے اولیاء کی نصیحتوں کے مطابق عمل انجام دینا مفید ہے اور یہی اطمینان ہے جو انسانی زندگی کا اصل محرک اور انتخاب کا ترازو ہے۔

قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی نورانی تعلیمات کا جائزہ لے کر طرز زندگی کے مختلف شعبوں میں ایمان کے موثر ہونے کے بارے میں بہت سی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں اس حصے میں ان میں سے کچھ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

الف: خدا کے ساتھ ارتباط و رابطہ

وہ شعبہ جہاں ایمان طرز زندگی پر موثر ہے، وہ اللہ کے ساتھ انسانی تعامل اور ارتباط کا شعبہ ہے۔ وہ افراد جو ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں وہ نماز[۱]، دعا[۲] اور تہجد[۳] کے ذریعہ سے خدا کے ساتھ اپنے تعلقات و روابط کو برقرار رکھتے ہیں اور انتہائی مشکل حالات جیسے میدان جنگ و جہاد میں بھی اس مستحکم ارتباط سے جدا ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں کیوں کہ وہ کلام وحی" إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ"[۴] کی سچائی پر پکا اور راسخ ایمان رکھتے ہیں کہ خالق کائنات کے ساتھ یہ ارتباط ان کی تخلیق کا فلسفہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔ترجمہ: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔[۵]

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۳؛ سورہ انعام، آیت ۹۲؛ سورہ انفال، آیت ۳ و ۴

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۷، سورہ ذاریات، آیت ۱۸

۳۔ سورہ فرقان، آیت ۶۴؛ سورہ سجدہ، آیت ۱۵ و ۱۶؛ سورہ ذاریات، آیت ۱۷

۴۔ بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ (سورہ عنکبوت، آیت ۴۵)

۵۔ سورہ ذاریات، آیت ۵۶

لہٰذا وہ اپنی زندگی میں اس مقدس ارتباط و تعلق کی جگہ کسی اور چیز کو رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور جو بھی چیز اس بندگی کے تعلقات نقصان کو پہونچانا چاہے وہ خود ہی اس سے دوری اختیار کر لیتے ہیں اور وہ الٰہی بندگی کی لذت کو کسی بھی لذت سے بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

الٰہی ارتباط و تعلق میں حقیقی ایمان کی تاثیر مومن انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر ایک شعبے میں خدا کو حاضر و ناظر دیکھتا ہے اور اپنے تمام افعال میں وہ صرف خدا کی خوشنودی کو مد نظر رکھتا ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔

ترجمہ: (اے رسول) کہو میری نماز اور میری تمام (مختلف) عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔[1]

❖

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۔إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا۔ ترجمہ: اور وہ اس (اللہ) کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔۔) اور کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کیلئے کھلاتے ہیں نہ تم سے کوئی جزا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔[2]

ب: دوسروں کے ساتھ ارتباط و رابطہ

زندگی کو اسلامی بنانے کے طرز میں سے ایک طرز زندگی دوسرے لوگوں کے ساتھ منجملہ گھر والوں، رشتہ داروں، دوستوں، پڑوسیوں، ہم وطنوں وغیرہ کے ساتھ تعلقات برقرار کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے روابط کو اسلامی بنانے میں خدا اور قیامت پر قلبی ایمان و یقین ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ مومن، مومنین کے روابط کا معیار رضائے الٰہی، قرآنی

۱۔ سورہ انعام، آیت ۱۶۲

۲۔ سورہ انسان، آیت ۸۔۹

مواعظ و سفارشات کی رعایت اور اہل بیت علیہم السلام اور اولیائے الٰہی کی تعلیمات ہیں لہٰذا نبی اکرمؐ کی وہ حدیث جس میں انہوں نے خاندان کے ساتھ سلوک و برتاؤ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

"اس کا ایمان زیادہ مکمل ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ زیادہ خوش اخلاق اور مہربان ہے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مہربان ہوں"[۱]۔

اس حدیث نبوی کے مطابق مومنین بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ اسی طرح برتاؤ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی کی مشکلات میں صبر و بردباری کا دامن تھامے رکھنے کی وجہ سے وہ اجتماعی اور سماجی نقصانات (جیسے طلاق اور نشے کی عادت) کو اپنے گھر والوں کی سلامتی کو خطرہ میں ڈالنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اعداد و شمار کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مذہبی اعتقادات رکھنے والے گھرانوں اور خاندانوں میں طلاق کی تعداد میں کمی کا ایک سبب ان گھرانوں کے مذہبی عقائد اور ایمان ہیں۔[۲]

مومنین آیات الٰہی سے استفادہ کرتے ہوئے (وہ آیات جو والدین اور لوگوں کے ساتھ بات چیت کے انداز میں مہربانی، تواضع، خوش روئی اور خوش کلامی کی سفارش کرتی ہیں) یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کی ملاقات کے وقت ان قرآنی معیار کی رعایت کریں اور مومنین جاہل افراد کی ملاقات کے وقت ہر طرح کے غضب اور غصہ کا اظہار کرنے سے پرہیز کرتے ہیں[۳]۔ زمانہ کے ناسازگار حالات میں اور مصیبتوں سے روبرو ہونے کے وقت بھی وہ یاد خدا کو اپنی زندگی کا مقدمہ اور دیباچہ قرار دیتے ہیں اور آیت استرجاع الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ[۴] کو یاد کرکے خدا کے ساتھ اپنے رشتے کو برقرار رکھتے ہیں اور خود کو رحمت الٰہی کے سایہ میں قرار دیتے ہیں: أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔[۵]

۱۔ بابویہ، علی بن محمد، من لایحضرہ الفقیہ (ج ۲) ص ۳۶

۲۔ فاتحی زادہ، مریم السادات و دیگران، بررسی تاثیر عوامل خانوادگی در پایان آمار طلاق، ۱۱۷ سے ۱۳۶ تک

۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۸۳؛ سورہ اسراء، آیت ۲۴؛ سورہ فرقان، آیت ۶۳؛ سورہ عنکبوت، آیت ۸؛ سورہ مجادلہ، آیت ۱۱

۴۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۵۶

۵۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۵۷

ج: انفرادی میدان

ایک اور میدان جہاں ایمان بہت ہی اہم تبدیلیاں ایجاد کر سکتا ہے وہ انفرادی میدان ہے کیوں کہ مومن انسان اسلام کی تمام سفارشات اور نصیحتوں کو حکمت آمیز اور اخروی اور دنیوی منافع والی جانتا ہے۔ لہٰذا وہ انہیں اپنی زندگی میں اتارنے کے لئے اپنی تمام ہمت و کوشش کو خرچ کر دیتا ہے تاکہ وہ ان منافع کو حاصل کر سکے۔ اسی بنیاد پر کھانے، پینے، پہننے، سفر کرنے، زیب و زینت، مسکن و منزل، کاروبار تفریح، مہمان نوازی، نظافت و پاکیزگی، خوشی، غم، اور حصولِ علم وغیرہ کے طریقۂ کار میں ان کے انتخاب کا معیار و ملاک دینی تعلیمات میں طے شدہ انداز (طور طریقہ) اور نمونہ ہے اور ہر وہ طور طریقہ جو مذہبی نصیحتوں کے خلاف ہو مومن اس سے پرہیز کرتا ہے اور وہ کسی بھی صورت میں راضی نہیں ہے کہ غیر خدا کی خوشنودی کے لئے دینی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دے اور الٰہی حدود سے دست بردار ہو جائے[۱]۔

مومن انسان کے تمام افعال میں ایک مہم معیار، خدا اور رسول خداؐ کے فرامین کی اطاعت اور پیروی ہے[۲]۔ مومنین اور متقین افراد اہل بیت علیہم السلام کی احادیث سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، بالخصوص حضرت امیر المومنینؑ کے نورانی خطبہ، خطبۂ متقین سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کے تمام شعبوں (چاہے وہ شعبے انفرادی، خاندانی اور سماجی واجتماعی ہوں) کو اس خطبہ میں بیان شدہ معیار وملاک کی بنیاد پر منظّم بناتے ہیں کیوں کہ انہیں یہ یقین حاصل ہو چکا ہے کہ سعادت کا واحد راستہ ثقلین (یعنی قرآن و اہل بیت علیہم السلام) کی پیروی ہے اور ان دو الٰہی امانتوں کی راہ سے ہر قسم کا انحراف گمراہی اور بدبختی کے سوا کچھ نہیں ہے۔[۳]

۱۔ سورہ توبہ، آیت ۱۱۱ و ۱۱۲

۲۔ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ ترجمہ: اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں یہ سب باہم دگر یکرنگ و ہم آہنگ ہیں وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم فرمائے گا۔ یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑا حکمت والا ہے۔ (سورہ توبہ، آیت ۷۱)

۳۔ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی (ج ۱) ص ۲۹۴

طرز زندگی پر ایمان کے مختلف اثرات

لوگوں کے ایمان اور باطنی عقائد کی سطح کا مختلف ہونا ان کے طرز عمل میں ان عقائد کے موثر ہونے میں بھی اختلاف کا سبب ہوگا (یعنی انسانی طرز عمل اور رفتار و کردار میں جو اختلافات پایا جاتا ہے) اور ایمان کا درجہ جتنا بلند اور گہرا ہوگا رفتار و کردار میں اس کا اثر یا اس کی جھلک بھی اتنی ہی زیادہ واضح و آشکار ہوگی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایمان کے صاحب مراتب ہونے کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: ''یقیناً ایمان کے دس درجے ہیں ایمان ایک سیڑھی کے مثل ہے کہ زینہ بہ زینہ جس سے اوپر جاتے ہیں[1]۔ قرآن مجید میں بھی اس نکتہ کی طرف اس جگہ اشارہ ہوا ہے جہاں پر اللہ نے ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۔ ترجمہ: (کامل) ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دھل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک حال میں اپنے پروردگار پر توکل (بھروسہ) رکھتے ہیں۔[2]

ایمان اور قلبی عقائد کو مستحکم کرنے کے راستے

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ افراد کے قلبی عقائد اور ایمان جس قدر قوی اور عمیق ہوں گے تو ان افراد کی زندگی بھی زندگی کے مختلف شعبوں یعنی انفرادی و اجتماعی شعبوں میں مزید اسلامی ہوتی چلی جائے گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سبھی افراد اسلامی زندگی کے حصول کے لئے اپنے مذہبی عقائد کو مستحکم کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن مجید اور احادیث ائمہ اطہار علیہم السلام میں طرز زندگی کو اسلامی بنانے کے متعدد راہ حل پائے جاتے ہیں ان میں سے جو بہت زیادہ مہم ہیں ان کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱۔ الکافی (ج ۲)، ص ۴۵

۲۔ سورہ انفال، آیت ۲

۱۔**خدا کی یاد:** سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۰ کے مطابق جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے مُردوں کے زندہ ہونے کے بارے میں سوال کیا، تو خداوند عالم نے ان سے پوچھا:

"اے ابراہیم! کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟"

تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ مجھے اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے"۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ جواب اس بات کو وضاحت سے بیان کر رہا ہے کہ اطمینان قلب کا رتبہ و مقام ایمان سے کہیں بلند و بالا ہے۔ اس نکتہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اطمینان قلب (جو ایمان سے بالاتر ہے) کے حصول کا راستہ کیا ہے؟ تو خداوند عالم نے انسان کو مرحلۂ اطمینان تک پہنچنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللَّـهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔ ترجمہ: یاد رکھو ذکرِ الٰہی سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔[1]

۲۔**معجزات و کرامات کا دیدار:** ایمان کے درجات کو بلند ہو کر اطمینانِ قلب (کہ جس کی تعلیم خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمائی) کی منزل میں پہنچنے کا ایک اور راستہ، اذنِ پروردگار سے ذبح شدہ چار پرندوں کا زندہ ہوتے ہوئے مشاہدہ کرنا بھی ہے۔ لہٰذا خداوند عالم کے عظیم معجزہ کے وجود کا دیدار یعنی قرآن کریم اور ائمہ اطہار علیہم السلام اور اولیائے خدا کی کرامات کے بارے میں قطعی اسناد کا وجود اور ان میں غور و فکر اور ان کے بارے میں دقیق علم و معرفت انسانی ایمان و عقیدہ کی تقویت میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

۳۔**قرآن سے مانوس ہونا:** قرآن سے مانوس ہونا ایمان کو مستحکم کرنے کی راہوں میں سے ایک ہے کہ خداوند عالم نے مومنین کی توصیف میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ سورہ رعد، آیت ۲۸

(کامل) ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دھل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک حال میں اپنے پروردگار پر توکل (بھروسہ) رکھتے ہیں۔[۱]

۴۔ **محبت اہلبیت علیہم السلام**: ایمان کو مضبوط اور قوی کرنے والے اسباب میں سے ایک سبب حضرت پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اہلبیتؑ کی محبت و مودت ہے۔ قرآن کی آیت قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ[۲] کے مطابق اگر خداوند عالم نے رسولؐ کو یہ حکم دیا ہے کہ:

"اے میرے رسولؐ! کہو: میں اپنے اہلبیتؑ کی محبت و مودت کے سوا تم سے کچھ اور نہیں چاہتا"۔

تو سورۂ سبا کی ۴۷ نمبر آیت قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ کے مضمون کے مطابق اس وعظ و نصیحت کا فائدہ خود امت کی طرف پلٹے گا اور اس صورت حال کے علاوہ آنحضرتؐ کی رسالت کا صلہ خود خدا کے ذمہ ہے اسی بنیاد پر امام علیؑ نے اہلبیت علیہم السلام سے عشق و محبت کے فائدہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"کیا کہنا اس شخص کا کہ جس کے دل میں ہم اہلبیتؑ کی محبت رسوخ پیدا کر چکی ہے (استواری کے ساتھ پائی جاتی ہے)۔ ایسے شخص کے ذمہ ایمان کوہِ احد کے اپنی جگہ ثابت ہونے سے بھی زیادہ ثابت ہوگا اور جس کے بھی دل میں ہم اہلبیتؑ کی محبت نہ ہو اس کے دل میں ایمان پانی میں نمک کے پگھلنے کی طرح پگھل جاتا ہے"[۳]۔

۱۔ سورہ انفال، آیت ۲

۲۔ سورہ شوریٰ، آیت ۲۳

۳۔ ہلالی، سلیم بن قیس، اسرار آل محمد، ص ۵۱۵ و ۵۱۶

۵۔**الٰہی مواعظ و نصائح پر عمل پیرا ہونا**: ایمان کو مستحکم اور قوی کرنے کا ایک اور راستہ خدا کے احکام و مواعظ پر عمل کرنا ہے کیوں کہ جب انسان رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر تقرب کی نیت کے ساتھ خدا اور اس کے اولیاء کی نصیحتوں پر عمل کرتا ہے تو الٰہی فضائل و برکات اس کے شامل حال ہوتی ہیں۔ قرآن مجید اس پس منظر میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا۔ ترجمہ: اور اگر یہ اس نصیحت پر عمل کرتے، جو ان کو کی جاتی ہے، تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ اور ثابت قدمی کا زیادہ موجب ہوتا۔[1]

۶۔**دعا کرنا**: جب خداوند عالم قرآن مجید میں انسان کو دعا کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اجابت دعا کا وعدہ بھی کرتا ہے: ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ ترجمہ: تم مجھ سے دعا کرو۔ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔[2]

تو یقینی طور پر اگر کوئی شخص اجابتِ دعاء کی شرائط کی رعایت کے ساتھ خداوند متعال سے اپنے ایمان کے قوی اور مستحکم ہونے کا مطالبہ کرے تو خدا بھی اس کی دعا کو قبول کرے گا اور اس کے ایمان کو قوی اور مستحکم بنادے گا۔ اسی وجہ سے ائمہ ھدیٰ علیہم السلام نے ایمان کی تقویت و حفاظت کے لئے بعض دعاؤں کے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

۷۔**اخلاقی خوبیوں کا حاصل کرنا**: اگرچہ اخلاقی خوبیوں کے وجود میں آنے کا اصل وسیلہ و ذریعہ ایمان ہے لیکن ایمان کی تقویت اور اس کا مضبوط ہونا اسی قسم کے اعمال کے لگاتار انجام پانے سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۔ ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہدایت طلب کی ہے اللہ ان کی ہدایت میں اور اضافہ کرتا ہے اور ان کو (ان کے حصے

۱۔ سورہ نساء، آیت ۶۶

۲۔ سورہ غافر، آیت ۶۰

کی) پرہیزگاری عطا کرتا ہے۔[۱]

اہل بیت علیہم السلام کے اقوال و احادیث کے درمیان اس بارے میں بیش قیمت نکات پائے جاتے ہیں کہ جن میں سے یہاں پر بعض کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱-۷۔ **وعدہ کی وفا، صداقت، حیااور خوش اخلاقی**: ابو حمزہ ثمالی کا بیان ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: چار چیزیں جس میں بھی ہوں اس کا ایمان کامل ہےاور اس کے ایمان کو ان سے مدد ملتی ہےاور اس کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور وہ دیدار خدا کے لئے اس عالم میں پہنچتا ہے کہ خدا اس سے راضی و خوشنود ہے اور اگر گناہ اس کے تمام وجود کو بھی گھیرے ہوئے ہوں تو خدا انہیں بھی ختم کر دے گا۔ وہ چار صفتیں یہ ہیں:

۱۔ انسان نے خدا سے جو وعدہ کیا ہے اس وعدہ کی وفا۔

۲۔ لوگوں کے ساتھ صداقت و راستگوئی سے پیش آنا۔

۳۔ جو چیزیں خدا اور لوگوں کے نزدیک بری ہیں ان سے شرم و حیا کرنا۔

۴۔ گھر والوں اور تمام لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا[۲]

خوش اخلاقی ایمان کی تکمیل و تقویت میں موثر ہے۔ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے منقول ہے کہ:

"اپنے اخلاق کو اچھا بناؤ تاکہ تمہارا ایمان مکمل ہو جائے"۔[۳]

نبی اکرمؐ نے ہی ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

"تم میں ایمان کے اعتبار سے کامل و اکمل وہ ہے جس کا اخلاق تم میں سب سے بہتر ہے۔"[۴]

۲-۷۔ **بیہودہ گوئی سے زبان کو محفوظ رکھنا**: ایمان کی تقویت اور استحکام کا ایک اور عامل زبان کو بے ہودہ گوئی اور ہر طرح کی لغزش و انحراف سے محفوظ رکھنا ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے

۱۔ سورہ محمد، آیت ۱۷

۲۔ شیخ مفید، محمد، الامالی، ص ۱۸۵

۳۔ ری شہری، محمد مہدی، میزان الحکمۃ (ج ۱)

۴۔ تحف العقول، ص ۷۹

اس بارے میں ارشاد فرمایا: ''کسی بھی بندے کا ایمان اس وقت تک مستحکم و مضبوط نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل مضبوط نہ ہو اور دل اس وقت تک مضبوط نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی زبان (احکام الٰہی کی پابندی میں) مضبوط نہ ہو''۔[1]

۳-۷۔کامل و مکمل وضو، نماز کو بہتر طریقے سے ادا کرنا، زکات کی ادائیگی، غصے پر کنٹرول اور قابو پانا، زبان کو بے ہودہ گوئی سے محفوظ رکھنا، استغفار کرنا اور اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں خیر خواہ ہونا۔

نبی اکرمؐ نے حقیقت ایمان کو حاصل کرنے کے طریقۂ کار کے بارے میں حضرت علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَا عَلِي! سَبْعَةٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ، فَقَدِ اسْتَكْمَلَ حَقِيْقَةَالْاِيْمَانِ وَاَبْوَابُ الْجَنَّةِ مُفَتَّحَةٌ لَهُ: مَنْ اَسْبَغَ وُضُوئَه وَاَحْسَنَ صَلَاتَهُ وَاَدَّىٰ زَكٰوةَ مَالِهٖ وَكَفَّ غَضَبَهُ وَسَجَنَ لِسَانَهُ وَاسْتَغْفَرَ لِذَنْبِهٖ وَاَدَّى النَّصِيْحَةَ لِاَهْلِ بَيْتِ نَبِيِّه۔

ترجمہ: اے علیؑ! سات خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں بھی پائی جائیں اس نے ایمان کی حقیقت کو پالیا ہے اور جنت کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے گئے ہیں ۱۔جو شخص مکمل یعنی تمام شرائطِ وضو کی رعایت کے ساتھ وضو کرے۔ ۲۔اپنی نماز کو بہتر طریقہ سے ادا کرے۔ ۳۔زکات ادا کرے۔ ۴۔اپنے غصے پر قابو پالے۔ ۵۔اپنی زبان کو تمام باطل اور ناحق چیزوں سے محفوظ رکھے۔ ۶۔اپنے گناہوں کے سبب استغفار کرے۔ ۷۔اور نبی اکرمؐ کے گھر والوں (اہل بیتؑ) کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کا خیر خواہ ہو۔[2]

نبی اکرمؐ کے اہل بیتؑ کے ساتھ خیر خواہی سے مراد ان کی شناخت و معرفت، ان کی اطاعت، ان کی مودت، ان کے حق کو ادا کرنا اور ان کے حریم کا دفاع و تحفظ ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، ص ۳۳۷

۲۔ شیخ صدوق (ج ۴)، ص ۳۵۸

۴-۷۔ دین کی معرفت، زندگی میں اعتدال اور مصائب و مشکلات پر صبر: حقیقت ایمان کو حاصل کرنے کے راستے کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

لَا يَسْتَكْمِلُ عَبْدٌ حَقِيْقَةَ الْاِيْمَانِ حَتّى يَكُونَ فِيْهِ خِصَالٌ ثَلَاثٌ: اَلتَّفَقُّهُ فِي الدِّيْنِ وَحُسْنُ التَّقْدِيْرِ فِي الْمَعِيْشَةِ وَالصَّبْرُ عَلَى الرَّزَايَا۔ ترجمہ: کوئی بھی بندہ اس وقت تک حقیقت ایمان کو حاصل ہی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے اندر تین خصلتیں نہ پائی جائیں: ا۔ دقت کے ساتھ علم دین حاصل کرنا۔ ۲۔ زندگی میں بہتر اعتدال و میانہ روی سے کام لینا۔ ۳۔ مشکلات و مصائب پر صبر[۱]۔

۵-۷۔ جھوٹ کو ترک کر دینا: انسان کے لیے حقیقت ایمان کو حاصل کرنے کے راستے کے بارے میں حضرت امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

لَا يَجِدُ عَبْدٌ حَقِيْقَةَالْاِيْمَانِ حَتىٰ يَدع الكَذِبَ جده و هزله۔ ترجمہ: کوئی بھی بندہ ایمان کو اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ سنجیدہ حالت میں یا مذاق میں جھوٹ کو ترک نہ کرے[۲]۔

۶-۷۔ خدا کے دوستوں سے دوستی اور خدا کے دشمنوں سے دشمنی اور سچے لوگوں کا ساتھ: ابو حمزہ ثمالی بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے اس بارے میں سوال کیا کہ کیا کروں کہ میرا ایمان کامل ہو جائے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:

۱۔ برقی، احمد بن محمد خالد، المحاسن (ج ۱) ص ۶

۲۔ المحاسن (ج ۱) ص ۱۱۹

تَوَالِیْ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ وَ تَعَادِیْ اَعْدَاءَ اللّٰہِ وَ تَکُوْنُ مَعَ الصَّادِقِیْنَ۔ ترجمہ: خدا کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی اور سچوں کی ہمراہی (کامل ایمان ہونے کا سبب) ہے۔[1]

۷-۷-**یقین حاصل کرنا**: ایمان کو مستحکم و مضبوط بنانے کی راہوں میں سے ایک راہ یقین کا حاصل کرنا بھی ہے کیوں کہ ایمان علم و یقین کی مدد کے بغیر فرد کے خطرات و مشکلات سے روبرو ہونے کے وقت انسان کو سقوط و لغزش سے بچانے کی قوت و طاقت نہیں رکھتا لیکن اگر ایمان عمیق و دقیق آگاہی یعنی یقین کا نتیجہ ہو تو انسان کو گمراہ کرنے والی مشکلات سے محفوظ رکھے گا۔ حضرت امیر المومنین علیؑ اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

قَوُّوْا اِیْمَانَکُمْ بِالْیَقِیْنِ فَاِنَّہٗ اَفْضَلُ الدِّیْنِ۔ ترجمہ: اپنے ایمان کو یقین کے ذریعہ قوی اور مضبوط بناؤ کیوں کہ اس قسم کا ایمان افضلِ دین ہے۔[2]

۲۔ دینی تعلیمات کی طرف دعوت دینے والے افراد کے قول و عمل میں مطابقت کا پایا جانا

وہ عوامل جو طرز زندگی کے اسلامی ہونے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان میں سے ایک مبلغین کا ان دینی تعلیمات پر عمل کرنا ہے جو تعلیمات زندگی جینے کا طریقہ اور سلیقہ سکھاتی ہیں کیوں کہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ مبلغین بھی خود دینی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں تو وہ بھی اپنی طرز زندگی کی بنیاد انہیں مبلغین کے اعمال کے مطابق رکھیں گے اور بہت ہی جلد اور بہتر طریقہ سے ان مواعظ و سفارشات کو قبول کر لیں گے لیکن اگر وہ مبلغین کے قول و عمل میں مطابقت نہ دیکھیں گے تو وہ بالکل ہی ان دینی تعلیمات کو قبول نہیں کریں گے یا مشکل سے قبول کریں گے۔

کبھی کبھی مبلغین کے عمل کا قول کے مطابق نہ ہونا (یعنی صرف کہنا عمل نہ کرنا) یا قول کا اس کے بر عکس عمل کے ساتھ مطابق ہونا (یعنی کہنا کچھ اور کرنا کچھ) برا اثر رکھتا ہے اور پیام کی نابودی کا سبب بن جاتا

۱۔ عیاشی، محمد بن مسعود، تفسیر عیاشی (ج ۲) ص ۱۱۷

۲۔ آمدی، عبدالواحد تمیمی، تصنیف غرر الحکم و درر الحکم، ص ۶۲

ہے۔ شاید یہ سامعین و مخاطبین کو مذہبی تعلیمات کے برعکس عمل کرنے کی دعوت دے سکتا ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کے اقوال میں اس مسئلہ کی جانب ایک خاص توجہ دی گئی ہے۔ حضرت علیؑ نے ایسے گروہ کے بارے ارشاد فرمایا ہے جو لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے:

"جس نے بھی خود کو لوگوں کا راہنما اور پیشوا قرار دیا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرے اور اس سے قبل کہ لوگوں کو اپنی زبان سے (اچھے اعمال کی) دعوت دے اسے چاہیے کہ اپنے اعمال و کردار سے (اچھائی کی) دعوت دے جو شخص خود کی اصلاح میں مصروف و مشغول ہے تو وہ اس شخص سے کہیں زیادہ عزت کا مستحق ہے جو لوگوں کا استاد اور مربی ہے"[1]۔

امام جعفر صادقؑ نے بھی اس بارے میں ارشاد فرمایا:

"لوگوں کو اپنی زبان کے علاوہ (اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ) سے دعوت دو"۔[2]

امام خمینیؒ نے لوگوں کو نیک اعمال کی دعوت دینے والے افراد (مبلغین) کی اصلاح کی ضرورت کے بارے میں فرمایا:

"اب جب کہ ہم ان باطل طاقتوں کو ختم (نیست و نابود) کر چکے ہیں اور اس وقت ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہماری حکومت اسلامی ہے اور ہماری حکومت کا نظام بھی نظامِ اسلامی ہے تو صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ ایک لفظ کا ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیں یا ایک حکومت کو سرنگوں اور نابود کرنے کے بعد اس کی جگہ ایک دوسری حکومت رکھ دیں۔ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے کہ کم از کم علمائے اسلام (جو باخبر اور آگاہ ہیں) کہ جن کا سروکار لوگوں کے قلوب کے ساتھ ہے جو لوگوں کو مذہبی تعلیمات کی طرف بلاتے ہیں، جن کا سروکار لوگوں کی روح کے ساتھ ہے، آپ لوگوں کے

۱۔ نہج البلاغہ، ص ۶۳۹

۲۔ الکافی (ج ۲)، ص ۷۸

لئے ضروری ہے کہ اپنی روح اور اپنے دل کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں اور اپنی روح اور اپنے دل کو بھی الٰہی بنائیں۔ اب جب کہ ہم حضرت امیر علیہ السلام نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان کے شیعہ ہو سکتے ہیں جیسا کہ خود حضرت امیر علیہ السلام نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ تم ہماری طرح تو نہیں ہو سکتے لیکن تقویٰ اور اس جیسے اعمال کے ذریعہ سے تم ہماری مدد کرو"۔[1]

دینی اور مذہبی مبلغین کے عمل کے مؤثر ہونے کے بارے میں مقام معظم رہبری آیت اللہ خامنہ ای (حفظہ اللہ) بھی فرماتے ہیں:

"ہمارے طرز عمل میں بیٹھنا اور کھڑا ہونا، سماجی زندگی گزارنے کا طور طریقہ، ہمارا نظریہ اور ہماری عبادت، ہمارا دنیاوی نعمتوں سے وابستہ ہونا یا نہ ہونا یہاں تک کہ ہمارا کھانا اور سونا (کنایہ ہے عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے سے) سب سے مؤثر تبلیغ ہے یا تبلیغ کی ضد ہے۔ اگر مذہبی مبلغین کے اعمال صحیح ہوں تو خود وہی اعمال ہی تبلیغ دین ہیں اور اگر ان کے اعمال صحیح نہ ہوں تو خود وہی اعمال ہی دینی تبلیغ کی نقیض و ضد ہیں۔ ہم سماجی ماحول اور زندگی کے مختلف حالات میں اپنی بات کی منشا کے متعلق لوگوں کو آخر کس طرح یقین دلا سکتے ہیں اور آخر کس طرح ان کے اعتماد کو برقرار رکھ سکتے ہیں جب کہ ہم دنیاوی خواہشات کی مذمت کے بارے میں کلام کرتے ہیں لیکن خدا نہ کرے کہ کہیں خود ہم اپنے قول کے مخالف عمل کر رہے ہوں، خدا نہ کرے کہ کہیں ایسا ہو کہ ہم مال و دولت اور پیسے سے وابستگی کی تو مذمت کریں اور دنیاوی غیر ضروری چیزوں کے راہ حصول میں حرکت اور جد و جہد کے بارے میں بھی مذمت کریں لیکن خود ہمارا ہی عمل ہمارے قول کا مخالف ہو، کس طرح ممکن ہے کہ ایسی تبلیغ اثر کرے گی؟ یا تو ایسی تبلیغ حقیقت میں بے اثر ہو گی یا اثر تو کرے گی لیکن وہ اثر زیادہ دیر تک باقی نہیں رہے گا، یا پھر وہ تبلیغ ایسا اثر

۱۔ خمینی، روح اللہ، صحیفہ نور (ج ۸) ص ۵۲۱

کرے گی کہ ہمارے اعمال کی حقیقت کے کشف ہونے کے بعد ہی ٹھیک اسی اثر کی نقیض میں تبدیل ہو جائے گی۔ لہٰذا قول کے ساتھ عمل بہت ضروری ہے" ۔[1]

بغیر عمل کی تبلیغ کے نتائج کے بارے میں دینی تعلیمات میں کچھ موارد بیان ہوئے ہیں کہ ان میں سے کچھ کی جانب یہاں پر اشارہ کیا جارہا ہے:

الف: **الٰہی غیض و غضب اور ملامت:** بغیر عمل کی تبلیغ کا ایک سب سے اہم نتیجہ خدائی غصہ، غضب اور ملامت ہے۔ خداوند عالم نے سورۂ بقرہ میں اس بارے میں ارشاد فرمایا:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ترجمہ: کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتابِ خدا کی تلاوت کرتے رہتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔[2]

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۔ترجمہ: اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم کہو ایسی بات جو کرو نہیں۔[3]

ب: **تبلیغ اور موعظہ کا بے اثر ہو جانا:** اس بارے میں رسول خداؐ نے جناب ابوذر کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا:

۱۔ بیانات رہبری، ۸۴/۱۱/۵

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۴۴

۳۔ سورہ صف، آیت ۲ و ۳

یَا اَبَاذَر ! مَثَلُ الَّذِیْ یَدْعُو بِغَیْرِ عَمَلٍ کَمَثَلِ الَّذِیْ یَرْمِیْ بِغَیْرِ وَتَرٍ۔ترجمہ: اے ابوذر! جو خود عمل نہیں کرتا اور لوگوں کو دین کی طرف بلاتا ہے اس کی مثال اس شخص کے جیسی ہے جو بغیر کمان کے تیر اندازی کرتا ہے۔[1]

امام جعفر صادقؑ نے بھی اس بارے میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْعَالِمَ اِذَا لَمْ یَعْمَلْ بِعِلْمِہٖ زَلَّتْ مَوْعِظَتُہٗ عَنِ الْقُلُوبِ کَمَا یَزِلُّ الْمَطَرُ عَنِ الصَّفَا۔ ترجمہ: اگر عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے تو اس کی نصیحتیں اور تبلیغ دلوں سے اس طرح پھسل جاتی ہیں جیسے بارش کے قطرات ہموار اور نا قابل تسخیر (مضبوط) چٹان سے پھسل جاتے ہیں"۔[2]

ج: **خدا سے دور ہو جانا**: امام سجادؑ اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ الْعَالِمَ اِذَا لَمْ یَعْمَلْ بِعِلْمِہٖ لَمْ یَزْدَدْ صَاحِبَہُ اِلّا کُفْراً وَ لَمْ یَزْدَدْ مِنَ اللّٰہِ اِلّا بُعْداً۔

ترجمہ: اگر عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے تو یہ علم صاحب علم کے کفر کا سبب بنے گا اور یہ علم صاحب علم کو صرف اور صرف خدا سے دور کرے گا۔[3]

د: **قیامت میں حسرت وافسوس کا سبب**: امام باقرؑ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا:

اَبْلِغْ شِیعَتَنَا اَنَّہُ لَنْ یَنَالَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ اِلّا بِعَمَلٍ وَ اَبْلِغْ شَیعَتَنَا اَنَّ اَعْظَمَ النَّاسَ حَسْرَۃیَومَ القِیامَۃِمَنْ وَصَفَ عَدْلاًیخَالِفُہُ اِلیٰ غَیرِہ۔

۱۔ طوسی، محمد بن حسن، الامالی، ۵۳۴

۲۔ الکافی (ج۱) ص ۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۴۵

ترجمہ: ہمارے شیعوں تک یہ پیغام پہنچا دو کہ عمل کے بغیر وہ الٰہی نعمتوں کو ہر گز نہیں پا سکتے اور یہ پیغام بھی ہمارے شیعوں تک پہنچا دو کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت وافسوس کرنے والا شخص وہ ہے جو عدل و عدالت کو تو بیان کرے لیکن خود اس پر عمل نہ کرے"[1]۔

و: **معاشرہ کا فاسد ہو جانا**: امام خمینیؒ نے اس بارے میں فرمایا:

"قوموں کی نگاہیں علماء پر ہیں لہٰذا اگر عالم فاسد ہو جائے تو دنیا فاسد ہو جائے گی۔ "اذا فسد العالم فسد العالم" کیوں کہ عالم کی نگاہیں عالم پر ہیں اور عوام کی توجہ ملک کے مفکرین پر ہے، ملک کے علماء پر ہے خدانخواستہ اگر وہ فاسد ہو گئے تو پورا ملک فاسد ہو جائے گا اور اگر وہ صالح ہوں تو پورا ملک صالح ہو جائے گا اور فلاح و بہبود کی طرف راغب ہوگا۔ میں خود پہلے جب کبھی کسی شہر میں جاتا تھا اور دیکھتا تھا کہ وہاں کے لوگ صالح اور اچھے ہیں اور جب توجہ کی جاتی تھی کہ کس طرح یہ سب کے سب صالح اور اچھے ہیں تو معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس شہر کا عالم ایک بہت ہی اچھا انسان ہے، ان سبھی افراد نے اس عالم کی پیروی کی ہے جو اچھا ہے"۔[2]

۳۔ حکمرانوں اور سماجی رہنماؤں کی زندگی میں اسلامی تعلقات کا نفاذ: لوگوں کے طرز زندگی کے اسلامی ہونے میں ایک اور اہم عامل جو مؤثر کردار ادا کرتا ہے حکمرانوں اور سماجی رہنماؤں کے زندگی گزارنے کا طور طریقہ ہے۔ یہ مسئلہ ایک نا قابل انکار معاشرتی اور سماجی حقیقت ہے کہ قرآن مجید اور احادیث اہلبیت علیہم السلام میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہوتا ہے:

"اور (قیامت کے دن) وہ سب خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو اس وقت کمزور لوگ (جاہل پیروکار) مستکبرین (گمراہ رہنماؤں) سے کہیں گے کہ ہم تو آپ کے پیروکار

۱۔ ایضاً (ج ۲) ص ۳۰۰

۲۔ صحیفہ نور (ج ۷) ص ۲۲۵

تھے اب جب کہ ہم آپ کی پیروی کی وجہ سے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئے ہیں تو کیا آپ عذاب الٰہی کا ایک حصہ قبول کرنے اور اسے ہم سے دور کرنے پر راضی ہیں؟" ۔[1]

حضرت امیر المومنینؑ نے بھی ارشاد فرمایا:

النَّاسُ بِاُمَرَائِهِم اَشْبَهُ مِنْهُم بِآبَائِهِم۔ترجمہ: لوگ اپنے آباء و اجداد سے زیادہ حکمرانوں اور بادشاہوں سے شباہت رکھتے ہیں۔[2]

امام خمینیؒ نے بھی معاشرہ کی اصلاح پر حکمرانوں کی طرز زندگی کے مؤثر ہونے کے بارے میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی عملی طرز زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: "ایک منصف اور عادل حاکم ایک ملک کو انصاف پسند بنا دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر حضرت علیؑ جیسا ایک انسان ایک حکومت اور ملک کا حکمران ہو اور اس حکومت کے لوگ اس کی زندگی کے طور طریقے کو دیکھیں کہ خود اس کی زندگی کیسی ہے، اس کے بچوں کی زندگی کیسی ہے اور جب عوام میں اپنے سربراہ مملکت کو دیکھا تو کیا دیکھا کہ ان کے حکمران کا کھانا اور لباس ان سے کم ہے اور جب نماز جمعہ پڑھانے آتا ہے تو وہ اور دھلی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہے کیوں کہ اس کے پاس وہی ایک قمیص ہے۔

(تاریخ کے اعتبار سے) اور منبر پر جب خطبہ دیتا ہے تو اپنے دامن کو اس طرح کرتا ہے تاکہ وہ خشک ہو جائے وہ ایک قمیص رکھتا ہے (اس کے پاس صرف وہی ایک قمیص ہے) اور جب کبھی دو کھردری قمیص خریدتا ہے تو جو بہتر ہے اسے قنبر کو دے دیتا ہے (تاریخ کے اعتبار سے) اور جو خراب ہے خود پہن لیتا ہے اور جب لوگ حضرت امیر علیہ السلام جیسی مخلوق کو دیکھتے ہیں کہ بہت سے ممالک (جیسے ایران، مصر، عراق، حجاز اور یمن) جس کی حکومت کا حصہ ہیں اور پھر جب اس کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں وہ اس طرح کی زندگی جیتے ہیں۔

جب کسی مملکت میں حضرت امیر علیہ السلام جیسا کوئی بزرگ ہوتا ہے تو اس مملکت اور حکومت کی اصلاح ہوتی ہے، اسلام یہی چاہتا ہے ہم نعرہ تو لگاتے ہیں یقیناً مگر ہم حضرت امیر علیہ السلام جیسی شخصیت کو پا ہی نہیں سکتے خود حضرت امیرؑ نے ارشاد فرمایا:

۱۔ سورہ ابراہیم، آیت ۲۱؛ سورہ غافر، آیت ۴۷

۲۔ تحف العقول، ص ۲۰۸

" تمہارا اس پر کوئی اختیار ہی نہیں ہے لیکن تم میری مدد ایمانداری اور امانتداری سے کرو"۔[۱]

آیۃ اللہ العظمی خامنہ ای نے بھی نظام کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقات میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ہم حکمرانوں اور عہدیداروں کا اسراف کرنا دوسرے لوگوں کے اسراف کا سبب ہے"۔ در حقیقت "الناس علیٰ دین ملوکھم"[۲] میں (ملوک) بادشاہ کے معنی میں نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہمارے پاس بادشاہت نہیں ہے بلکہ ملوک کے مصداق آپ ہیں۔ (الناس علیٰ دیننا) انہوں نے اپنے اس کلام کی تصدیق کے لئے کہ حکمرانوں کی طرز زندگی لوگوں کی طرز زندگی میں مؤثر ہے۔ میں نے ایک تاریخ میں یہ پڑھا کہ جب زمام حکومت ولید بن عبد الملک کے ہاتھوں میں آئی تو چونکہ اسے دولت وثروت، زیورات وجواہرات اور قیمتی چیزوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا لہٰذا جب گلی اور بازار کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے تو ان کی گفتگو انہیں سب چیزوں کے بارے میں ہوتی تھی جناب! فلاں لباس لائے ہیں آپ نے خریدا؟ فلاں شخص فلاں نگینہ (لعل وجواہر) لایا ہے آپ نے خریدا؟ یعنی سب کے سب زیورات اور ان کے مانند چیزوں کی خرید وفروخت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ولید کے بعد جب زمام حکومت سلیمان بن عبد الملک کے ہاتھوں میں آئی تو چونکہ وہ بلڈر تھا محل اور عمارتیں بنوانا اسے بہت پسند تھا، مورخ کہتا ہے یہاں تک کہ جب لوگ نماز کے لئے مسجد آتے تھے تو کوئی کہتا تھا جناب کیا آپ کے گھر کا تعمیری کام ختم ہو گیا؟ تو ان کی سبھی گفتگو انہیں چیزوں کے بارے میں ہوتی تھی ان دونوں کے بعد جب عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو چونکہ وہ اہل عبادت تھا لہٰذا گلی اور بازار کے لوگ جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے تو کوئی کہتا تھا جناب! کیا واقعی کل آپ نے دعائے رجب

۱۔ صحیفہ نور (ج۷) ص ۲۵۷

۲۔ بابویہ، علی بن محمد، من لایحضرہ الفقیہ (ج۱) ص ۱۵

پڑھی تھی؟ تو دوسرا کہتا تھا کیا آپ نے وہ دو رکعت نماز پڑھی؟ لہٰذا ہم حکمرانوں اور عہدیداروں کا طرز عمل لوگوں کے طرز عمل پر زبردست اثر کرتا ہے"۔[1]

ایک اور بیان میں انہوں نے لوگوں کے اسراف کے بارے میں حکمرانوں اور عہدیداروں کے کردار کے بارے میں بیان کیا ہے کہ: "لوگوں کے طرز عمل میں بہت زیادہ اسراف ان لوگوں کے رفتار و کردار کی وجہ سے ہے کہ جنہیں وہ بزرگ مانتے ہیں اگر اسراف عہدیداروں میں نہ ہو تو لوگوں میں بھی اسراف کم ہو جائے گا"۔[2]

نتیجہ

زندگی اس وقت خداوند حکیم و دانا کی طرف سے مقرر شدہ طور طریقوں کے مطابق ہو گی جب اس کے عوامل اور راستے فراہم ہو جائیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ انسانی ایمان و عقائد اس درجہ تک پہنچ جائیں کہ:

الف: سب سے پہلے ہم یہ سمجھ لیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب و دین ہے جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں زندگی گزارنے کے بہترین طریقوں کو انسانوں کے لئے قانون کی شکل میں لایا ہے۔

ب: زندگی گزارنے کی کیفیت کے بارے میں خدا اور اس کے اولیاء کی تمام نصیحتیں بندوں کے مصالح پر موقوف ہیں۔

ج: جیسے جیسے خداوند عالم اور قیامت کے بارے میں انسان کے وجود میں ایمان اور قلبی عقائد قوی ہوتے چلے جائیں گے انسانی زندگی بسر کرنے کا طور طریقہ بھی مزید الٰہی ہوتا چلا جائے گا۔

د: زندگی کے طور طریقے جتنے زیادہ اسلامی ہوں گے الٰہی برکات اور معنویت کا چراغ بھی اتنا ہی زیادہ روشن اور منور ہوتا چلا جائے گا۔

و: زندگی میں ہر قسم کے غیر اسلامی طور طریقوں سے دوری افراد اور معاشرے کو مختلف نقصانات سے بچانے کا سبب ہو گا۔

ا۔ بیانات رہبری: ۱۳۸۴/۴/۸

۲۔ بیانات رہبری، ۱۳۹۳/۱/۱

۲۔لوگ اسی وقت اپنی زندگی کے طور طریقوں کو مذہبی تعلیمات کی بنیاد پر منتخب اور منظّم کر سکتے ہیں کہ جب وہ ان تعلیمات کے مبلغین کو خود اس پر عمل کرتا ہوا دیکھ لیں۔

۳۔ سماجی زندگی کے طور طریقے اسی وقت اسلامی ہو سکتے ہیں کہ جب اس معاشرہ کے عہدیدار افراد اور حکمرانوں کی زندگی کے طور طریقے بھی اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر مبنی ہوں۔

منابع وماخذ

قرآن کریم

مفاتیح الجنان

- ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی، تحف العقول، جامعہ مدرسین، قم، ۱۳۶۴
- امام خمینی روح اللہ، صحیفہ نور، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۶۴
- آمدی، عبدالواحد تمیمی، تصنیف غرر الحکم و درر الحکم، دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۶۶
- بابویہ، علی بن محمد، من لایحضرہ الفقیہ، انتشارات جامعہ مدرسین، قم، ۱۴۱۳
- بابویہ، علی بن محمد، علل الشرائع، داوری، قم، ۱۳۸۵
- برقی، احمد بن محمد خالد، المحاسن، دار الکتب الاسلامیہ، قم، ۱۳۷۱
- حر عاملی، محمد بن حسن، وسائل الشیعہ، موسسہ آل البیت، قم، ۱۴۰۹
- حسین زادہ علی، سبک زندگی، موسسہ امام خمینیؒ، قم، ۱۳۹۳
- ری شہری، محمد مہدی، میزان الحکمۃ، دار الحدیث، قم، ۱۴۱۶
- شریف رضی، محمد بن حسین، نہج البلاغہ، ترجمہ: محمد دشتی، قم، ۱۳۷۹
- شریفی، احمد حسین، ہمیشہ بہار، نشر معارف، قم، ۱۳۹۱

- شیخ مفید، محمد، الامالی، ترجمہ: استاد ولی، آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۶۴
- طباطبائی، محمد حسین، المیزان، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، ۱۴۱۷
- طوسی، محمد بن حسن، الامالی، دار الثقافۃ، قم، ۱۴۱۴
- عیاشی، محمد بن مسعود، تفسیر عیاشی، تصحیح: سید ہاشم رسولی محلاتی، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، ۱۳۸۰
- فاتحی زادہ، مریم السادات و دیگران، بررسی تاثیر عوامل خانوادگی در پایان آمار طلاق، فصلنامہ مطالعات تربیتی و روان شناسی دورہ ۶، ش ۲۱، دانشگاہ فردوسی، مشہد، ۱۳۸۴
- فاضل، قانع، سبک زندگی، ضرورت ھا و راہبردھا، فصلنامہ تخصصی محفل، ش ۸، معاونت پژوھشی حوزہ علمیہ تہران، ۱۳۹۲
- کاویانی، محمد، سبک زندگی اسلامی و ابزار سنجش آن، پژوھشگاہ حوزہ و دانشگاہ، قم، ۱۳۹۱
- کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، ۱۳۶۵
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، موسسۃ الوفا، بیروت، ۱۴۰۴
- مصباح، محمد تقی، سبک زندگی اسلامی، ضرورت ہا و کاستی ہا، مجلّہ معرفت، ش ۱۸۵، موسسہ امام خمینی، قم، ۱۳۹۲
- مصطفوی، حسن، مصباح الشریعۃ، انجمن اسلامی حکمت و فلسفہ ایران، تہران، ۱۳۶۰
- مطہری، مرتضیٰ، مجموعہ آثار، انتشارات صدرا، تہران، ۱۳۸۷
- مہدوی کنی، محمد سعید، دین و سبک زندگی، دانشگاہ امام صادقؑ، تہران، ۱۳۸۷
- نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسائل، موسسہ آل البیت، قم، ۱۴۰۸
- ہلالی، سلیم بن قیس، اسرار آل محمد، الہادی، قم، ۱۴۱۶

امام حسن عسکری(ع) کی انفرادی اور اجتماعی سیرت

مؤلف: مولانا حیدر رضا

امام حسن عسکریؑ آٹھ ربیع الثانی ۲۳۲ھ میں جمعہ کے دن مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی علی نقیؑ تھا اور آپ کی معزز والدہ سلیل، حدیثہ اور سوسن کے نام سے معروف تھیں۔[1] آپ کے مشہور القاب ہادی، رفیق، زکی، خالص، سراج اور عسکری ہیں۔ آپ کی مدت امامت چھ سال تھی جس کی ابتدا ۲۵۴ھ میں ہوئی اور ۲۶۰ھ میں آپ کی شہادت کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

آپ اپنی پوری زندگی خاص کر اپنے دور امامت میں وقت کی طاغوتی طاقتوں سے مبارزہ کرتے رہے جس کے سبب آپ کو جلا وطن بھی کیا گیا اور وحشتناک اور تاریک قید خانوں میں مقید بھی کیا گیا بالآخر ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ میں شہر سامراء میں ۲۸ برس کی عمر میں پندرہویں عباسی خلیفہ (احمد معتمد) کے ذریعہ پر اسرار طور پر زہر دغا سے شہید کر دیئے گئے۔ امام علیہ السلام کی حیات مبارکہ درج ذیل ظالم و جابر خلفاء کے دور میں گذری:

(۱) ابن جعفر متوکل) (۲) محمد منتصر (۳) ابو العباس احمد مستعین (۴) ابو عبد اللہ معتز (۵) محمد مہتدی (۶) احمد معتمد۔ چونکہ آپ کو عسکر نامی محلے (جو عباسی ترک فوجیوں کی رہائش گاہ تھا) میں رکھا گیا تھا لہٰذا آپ کو عسکری کہا جاتا ہے۔[2]

حضرت حجت بن الحسن امام زمان علیہ السلام آپ کے اکلوتے بیٹے اور جانشین ہیں جو آپ کی شہادت کے بعد کشتی ولایت و امامت کے ناخدا قرار پائے۔ اگرچہ آج ان کے وجود کا سورج پردہ غیب میں

۱۔ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۳۶؛ مناقب آل ابی طالب (جلد ۳) ص ۵۲۳ ـ ۵۲۴

۲۔ منتخب التواریخ، ص ۸۲۸؛ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۳۶؛ اصول کافی (جلد ۱) ص ۵۰۳، باب مولد ابی محمد الحسن بن علی

ہے لیکن ایک دن ایسا آئے گا جب حکم خدا سے ظہور فرما کر ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

یوں تو امام حسن عسکری علیہ اسلام کی امامت پر بہت سی معتبر دلیلیں موجود ہیں لیکن انہیں معتبر دلائل میں سے ایک حسب ذیل روایت بھی ہے:

یحی بن یسار قنبری نقل کرتے ہیں کہ:

"امام علی نقی (امام ہادی) علیہ السلام نے اپنی شہادت سے چار مہینے پہلے اپنے بیٹے امام حسن عسکری علیہ السلام سے ایک وصیت کی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی امامت و خلافت کی طرف اشارہ بھی کیا اور پھر انہوں نے متعدد دوستوں اور شیعوں کو میرے ہمراہ اس وصیت پر گواہ بنایا"۔[1]

اس مضمون میں ہم امام حسن عسکری علیہ السلام کی ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو مثل خورشید تاریخ کے صفحات پر تاباں اور درخشاں ہیں:

ا۔ عبادت

امام حسن عسکریؑ بھی اپنے آباء کرام ہی کی طرح عابدوں کی زینت، سجدہ کرنے والوں کے سید و سردار اور عابد شب زندہ دار تھے آپ کی ذات عبادت الٰہی کے سلسلہ سے بھی تمام مخلوقات خداوندی کے لئے اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونۂ عمل تھی. (ہے اور ہمیشہ رہے گی)۔ نماز کے وقت تمام کاموں کو چھوڑ دیا کرتے تھے اور کسی بھی چیز کو نماز پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔

ابو ہاشم جعفری اس بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

"ایک دن میں گیارہویں امام کی خدمت اقدس میں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ

ا۔ اعلام الوری (جلد ۲) ص ۱۳۶؛ اصول کافی (ج ۱) ص ۳۲۵، باب الاشارۃ والنص علی ابی محمد، حدیث ۱؛ ارشاد المفید (جلد ۲) ص ۳۱۴؛ الفصول المھمۃ (جلد ۲) ص ۱۰۷۹؛ الغیبۃ للطوسی، ص ۲۲۴، بحار لانوار (جلد ۵۰) ص ۲۴۶؛ کشف الغمۃ (جلد ۳) ص ۱۹۹

امام حسن عسکری علیہ السلام کچھ تحریر فرما رہے ہیں۔ تبھی نماز کا وقت آ پہونچا۔امام علیہ السلام تحریر کو چھوڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔"[۱]

امام حسن عسکریؑ کی عبادت دلوں کو اس طرح مجذوب کر لیتی تھی کہ صاحبان دل یاد خدا میں مشغول ہو جایا کرتے تھے یہاں تک کہ گمراہ اور منحرف افراد بھی صراط مستقیم اور راہِ نجات پر گامزن ہو جایا کرتے تھے اور ان کا شمار وقت کے عبادت گزار اور تہجد گزار افراد میں ہونے لگتا تھا۔ بدترین لوگ آنحضرت کی ملکوتی جذابیت کے سبب بہترین انسان بن گئے۔

ایک دن بعض بنی عباس نے صالح بن وصیف (مھتدی عباسی کے چیف آف ملٹری کمانڈر) سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ امام حسن عسکریؑ پر قید خانے کی زندگی کو تنگ کر دے اور ان پر ظلم و زیادتی کرے تو صالح بن وصیف نے جواب دیا کہ میں نے اپنے دو نہایت ہی بے رحم، سنگدل، خونخوار اور برے جیلروں (زندان بانوں) کو ابو محمد ابن الرضا (امام حسن عسکری علیہ السلام) پر سختی کرنے کے لئے مقرر کر دیا ہے لیکن اب وہ دونوں ابو محمد (امام حسن عسکریؑ) کی معیت کے سبب بالکل بدل چکے ہیں اور عبادت و مناجات کے اعلی درجے کی طرف قدم بڑھا چکے ہیں۔

پھر صالح بن وصیف نے ان دو جیلروں کو بلایا اور بنی عباس کی موجودگی میں ان سے امام علیہ السلام کے حالات کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ان کے بارے میں کیا کہیں جو عابد شب زندہ دار ہیں دن میں روزہ رکھتے ہیں اور ساری رات عبادت الٰہیہ میں بسر کرتے ہیں اور ہمیشہ ذکر الٰہی ان کے ورد زباں ہے اور ان کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ جب بھی ہمیں دیکھتے ہیں تو ہمارے بدن شدت خوف سے لرز اٹھتے ہیں اور ہم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔جب بنی عباس نے یہ سب باتیں سنیں تو حیران و پریشان ہو کر واپس چلے آئے۔[۲]

۱۔ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۳۰۴؛ عیون المعجزات، ص ۱۲۳

۲۔ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۳۰۸؛ اعلام الوری (جلد ۲) ص ۱۵۰؛ ارشاد المفید (جلد ۲) ص ۳۳۴؛ اصول کافی (جلد ۱) ص ۵۱۲ وفیات الائمہ من علماء البحرین والقطیف، ص ۴۱۰

۲۔ سخاوت

چونکہ ائمہ اطہار علیہم السلام انسانی اعلی صفات کی بہترین مثال اور مکمل نمونۂ عمل ہیں لہٰذا زندگی کے ہر ایک مرحلے میں ان کی رفتار و کردار ان کے پیروکاروں کے لئے درس آموز اور معاون و مددگار ہے اور انہیں خوبصورت اور اعلی صفات میں سے ایک سخاوت بھی ہے۔

یوں تو دنیا میں حاتم طائی کی جود و سخا اور دریا دلی کے بڑے چرچے ہیں لیکن در حقیقت حاتم طائی جیسے سخی کی سخاوت بھی خاندان عصمت و طہارت کی جود و سخا کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ امام حسن عسکریؑ کے زمانہ میں ان کی سخاوت کا ڈنکا بج رہا تھا اور ہر طرف ان کی جود و سخا کا بول بالا تھا۔

محمد بن علی کا بیان ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب ہماری زندگی غربت و مفلسی کا شکار ہو گئی اور ہمارے ایامِ زندگی مشکل بھری راہوں سے گزرنے لگے تو میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ: چلو اب ابو محمد (امام حسن عسکریؑ) کی خدمت میں چلتے ہیں کیوں کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ سخی و فیاض ہیں اور اس لئے بھی کہ ہر طرف ان کی جود و سخا کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: بابا! کیا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا؛ نہیں میں نے تو انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔

ہم ایک ساتھ روانہ ہوئے راستہ میں مجھ سے میرے والد نے یہ کہا کہ اگر امام علیہ السلام ہمیں ۵۰۰ درہم عطا فرمائیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ اور اس طرح ہم اپنی ضروریات زندگی کو بھی پورا کر لیتے۔ ۲۰۰ سو درہم کے کپڑے خرید لیتے تو ۲۰۰ درہم قرض کے ادا کر دیتے اور بقیہ ۱۰۰ درہم میں نان و نفقہ اور دوسرے اخراجات کو پورا کر لیتے۔

تبھی میرے ضمیر کی آواز آئی کہ: اے کاش وہ مجھے بھی ۳۰۰ درہم عطا فرماتے تو ۱۰۰ درہم کی ایک سواری خریدتا اور ۱۰۰ درہم نان و نفقہ میں خرچ کرتا اور پہاڑی علاقوں (پہاڑی علاقوں سے مراد ہمدان اور قزوین کے علاقے ہیں) کی طرف سفر کرنے کے لئے ۱۰۰ درہم کے مناسب کپڑے اور پوشاک خرید لیتا۔ جب ہم امام علیہ السلام کے گھر کے قریب پہونچے تو امام حسن عسکری علیہ السلام کا غلام گھر سے باہر آیا اور آ کر کہنے لگا کہ علی بن ابراہیم اور ان کا فرزند محمد گھر میں داخل ہو جائیں۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو امام علیہ السلام کو سلام کیا جواب سلام کے بعد امامؑ نے میرے والد سے یہ کہا کہ: "اے علی! آخر ہماری ملاقات کے درمیان کون سی چیز حائل تھی کہ جس کے سبب تم اب تک ہمارے پاس نہیں آئے تھے؟"

میرے والد نے عرض کیا کہ: اے میرے آقا! میں شرمندہ تھا اس بات سے کہ میں اس عالم میں آپ سے ملاقات کروں جب کہ غربت و مفلسی کی زنجیروں اور بیڑیوں نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔

امام علیہ السلام کے دیدار کے بعد جب ہم ان کے گھر سے باہر نکلے تو ان کا خادم بھی گھر سے باہر آیا اور درہم کی ایک تھیلی میرے والد کے حوالہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ پانچ سو درہم ہیں۔ دو سو درہم لباس و پوشاک کی خریداری کے لئے اور دو سو درہم قرض کی ادائیگی کے لئے اور بقیہ سو درہم نان و نفقہ اور دیگر اخراجات کے لئے۔

اس کے بعد امام حسن عسکری علیہ السلام کے غلام نے درہم کی ایک دوسری تھیلی میرے حوالے کی اور پھر مجھ سے کہا کہ یہ تین سو درہم ہیں۔ سو درہم سواری کی خریداری کے لئے اور سو درہم لباس و پوشاک کی خریداری کے لئے اور بقیہ سو درہم دوسرے اخراجات کے لئے لیکن حکم امام علیہ السلام یہ ہے کہ پہاڑی علاقوں کا سفر نہ کرنا بلکہ سوراء جانا۔

راوی بیان کرتا ہے کہ:

> "جب میں حکم امام علیہ السلام کے مطابق سوراء پہونچا تو میری شادی ایک با اخلاق خاتون سے ہوئی جس کے بعد میں کبھی بھی غربت و مفلسی میں گرفتار نہیں ہوا"۔[1]

۳۔ زہد و پارسائی

کامل بن ابراہیم مدنی امام حسن عسکری علیہ السلام کے زہد کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ: کچھ سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی غرض سے میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ سفید اور نرم لباس پہنے ہوئے ہیں فوراً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ولیِ خدا اور

۱۔ اصول کافی (جلد ۱) کتاب الحجۃ، باب مولد ابی محمد الحسن بن علی، حدیث ۳، صفحہ ۵۰۶، بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۷۸؛ ارشاد المفید جلد ۲ صفحہ ۳۲۶

حجت خدا ہو کر خود تو نرم و نازک لباس پہنتے ہیں اور ہمیں برادران دینی سے ہمدردی کا حکم دیتے ہیں اور نرم و نازک لباس پہننے سے روکتے ہیں۔

میرے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ امام علیہ السلام زیر لب مسکرائے اور پھر انہوں نے میری اس غلط فہمی کا اس انداز سے ازالہ کیا کہ اپنی آستینوں کو چڑھا لیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سیاہ رنگ کا خشن اور ضخیم لباس پہنے ہوئے ہیں۔

پھر امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ:

یَا کَامِلُ هٰذَا لِلّٰه وَ هَذَا لَکُم۔ ترجمہ: اے کامل یہ کھردار اور خشن لباس میں نے خدا کے لئے پہن رکھا ہے اور یہ نرم و نازک لباس تم جیسے افراد کے لئے پہنے ہوئے ہوں۔[1]

۴۔ دوست تو دوست دشمن بھی آپ کے مدح سرا اور قصیدہ خواں تھے

آپ کے معنوی فضائل و کمالات کے سبب دوست و دشمن ہر ایک آپ کے شیفتہ و شیدا تھے اور دل سے آپ کے مرید اور آپ کے گرویدہ تھے۔ اپنے ارادہ سے یا غیر ارادی طور پر وہ آپ کا احترام کیا کرتے تھے. مثال کے طور پر ہم یہاں دو واقعات ذکر کر رہے ہیں۔

(ا) احمد بن عبید اللہ بن خاقان قمی حاکم وقت کا نمائندہ اور شہر قم کے خراج (ٹیکس) کا انچارج تھا اور ساتھ ہی ساتھ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے بہت سخت دشمنوں اور انہیں اذیت پہونچانے والوں میں سے ایک تھا۔ ان سب کے باوجود بھی وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے اخلاقی خصوصیات و صفات کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ:

"شہر سامراء میں رفتار و کردار عفت و پاکدامنی، شائستگی اور شان و شوکت کے لحاظ سے میں نے ابن الرضا (امام حسن عسکری علیہ السلام) سے بہتر کسی اور علوی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اپنے خاندان قبیلہ بنی ہاشم اور تمام لوگوں میں (یہاں تک کہ وزراء، سپہ سالاران لشکر، اشراف قوم و قبیلہ، اور عالی ظرف افراد کی

۱۔ مستدرک الوسائل (جلد ۳) ص ۲۴۳۔۲۴۴؛ مستدرک سفینۃ البحار (جلد ۹) ص ۲۲۰

بزم میں بھی) سب سے زیادہ عزیز اور محترم تھے۔اور میں نے اس حقیقت کا مشاہدہ خود اپنی انہیں آنکھوں سے کیا ہے۔

ایک دن میرے والد (جو حکومت کی ایک نمایاں شخصیت تھے) نے ایک عمومی جلسہ کا انعقاد کیا جبکہ میں ان کے پاس کھڑا تھا۔ تبھی محافظوں نے اطلاع دی کہ ابو محمد ابن الرضا (امام حسن عسکری علیہ السلام) دروازہ پر ہیں اور دربار میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو میرے والد نے بلند آواز سے کہا کہ: انہیں اندر آنے دو ۔ میں ان سب کی گفتگو سے حیرت زدہ تھا کیوں کہ میں نے اب تک صرف اسی چیز کا مشاہدہ کیا تھا کہ میرے والد کے حضور میں صرف انہیں افراد کا کنیت سے تعارف کرایا جاتا رہا ہے جو خلیفہ یا ولی عہد رہے ہوں۔اسی اثنا میں ایک گندم گوں، خوش قامت، حسین و جمیل اور مناسب قدو قامت کا جوان اپنے مخصوص انداز میں دربار میں داخل ہوا۔

جیسے ہی میرے والد کی نظر ان پر پڑی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے استقبال اور خیر مقدم کے لئے کچھ قدم آگے بڑھے۔اگرچہ اس سے پہلے کبھی بھی میں نے اپنے والد کو کسی ہاشمی یا کسی فوجی کمانڈر کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔اور جب میرے والد ان کے قریب پہونچے تو پہلے معانقہ کیا اور پھر ان کے رخسار مبارک اور سینہ کا بوسہ لینے لگے اور بعد ازآں انہیں اپنے تخت پر بٹھایا اور انہیں تخت پر بٹھانے کے بعد خود بھی ان کے پہلو میں بیٹھ گئے اور خلوص دل سے ان کے ساتھ محو گفتگو ہو گئے۔

گفتگو کے درمیان میرے والد مسلسل کہہ رہے تھے "میں آپ پر فدا ہو جاؤں – میں آپ پر قربان ہو جاؤں ۔"اس نامعلوم (اور نا شناختہ) جوان کے ساتھ میرے والد کی احترام آمیز ملاقات ہر لحظہ میری حیرت میں اضافہ کا سبب بن رہی تھی ۔ خدا حافظی (الوداعی دعا و سلام) کے وقت میرے والد بڑے ہی احترام کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دروازہ تک آئے۔

ابو محمد (امام حسن عسکری علیہ السلام) کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنے والد کے غلاموں سے یہ پوچھا کہ: آخر وہ کون تھے جن کا تعارف تم لوگوں نے میرے والد کے حضور میں کنیت کے ذریعہ کرایا تھا اور میرے والد بھی ان کے ساتھ اتنے احترام سے پیش آرہے تھے؟

تو انہوں نے جواب دیا کہ:

"وہ ایک علوی ہیں۔ انہیں حسن بن علی (علیہاالسلام) کہا جاتا ہے اور وہ ابن الرضا کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔"

ان کی یہ باتیں حیرت افزا تھیں اور مسلسل میری حیرت میں اضافہ کا سبب بن رہی تھیں لہٰذا جب رات آئی اور معمول کے مطابق میں نے اپنے والد کو تنہا پایا تو میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ:

"بابا! آخر وہ جوان کون تھے جن کا آج صبح میں نے دیدار کیا تھا اور آپ جن کا اتنا زیادہ احترام کر رہے تھے اور ان سے گفتگو کرنے کے درمیان آپ بار بار کہہ رہے تھے کہ (میں آپ پر فدا ہو جاؤں — میں پر قربان ہو جاؤں) اور آپ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ (میں بھی اور میرے ماں باپ بھی آپ پر فدا ہو جائیں؟)"

میرے والد نے جواب دیا کہ:

"بیٹا! وہ رافضیوں کے امام حسن عسکری بن علی ہیں جو ابن الرضا کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ پھر انہوں نے مختصر سی ایک خاموشی کے بعد یہ بیان کیا کہ:

اے میرے پیارے بیٹے! اگر زمام حکومت خلفاء بنی عباس کے ہاتھوں سے نکل جائے تو بنی ہاشم میں سے ان کے سوا کوئی مستحق حکومت نہیں ہوگا اور ایسا خود ان کی اپنی فضیلت، عفت و پاکدامنی، زہد و پرہیزگاری، ذاتی شائستگی اور ان کے بہترین اخلاق کے سبب ہے۔ اور اگر تم نے ان کے والد کا دیدار کیا ہوتا تو در حقیقت ایک مہذب، نجیب، معزز اور بافضیلت شخصیت کا دیدار کیا ہوتا۔

یہ تذکرے سن کر میں حیرت و تعجب کے دریا میں ڈوب سا گیا اور میرے والد کی بہ نسبت میرا غصہ بڑھتا چلا گیا۔ میری نظروں میں میرے والد کی باتیں مبالغہ آمیز تھیں لہٰذا اب میرا دل صرف اسی بات کا متمنی اور خواہشمند تھا کہ میں حسن بن علی (علیہاالسلام) کے متعلق جستجو اور تحقیق کروں۔ اور ان کی شخصیت کے متعلق تفحص سے کام لوں لہٰذا جب میں نے حسن بن علی (علیہاالسلام) کے بارے میں بنی ہاشم، سپہ سالاران لشکر، مصنفین، قضات، فقہاء اور دوسرے افراد سے سوال کیا تو میں ان سب کے نزدیک ابو محمد ابن الرضا کو عظیم المرتبت، بزرگ اور معزز پایا۔

اس تفحص کے بعد میں بھی ان کے اخلاق و کردار کا قائل اور مرید ہو گیا اور میں اس نتیجہ پر پہونچا

کہ دوست تو دوست، دشمن بھی ان کا ثناء خواں اور قصیدہ خواں ہے۔[1]

(۲) محمد بن اسماعیل نقل کرتے ہیں کہ:

علی بن نارمش ایک ناصبی اور دشمنان اولاد علی علیہ السلام میں سے ایک تھا اور اولاد علی علیہ السلام کو سب سے زیادہ اذیتیں دیا کرتا تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب اسی کے زندان میں امام حسن عسکری علیہ السلام کو قید کیا گیا اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ جتنی اذیت ابو محمد (امام حسن عسکری علیہ السلام) کو پہونچا سکتا ہے پہونچا اور ان پر جتنی سختیاں کر سکتا ہے کر۔ اگرچہ امام حسن عسکری علیہ السلام صرف ایک دن اس کے زندان میں مقید تھے لیکن پھر بھی اس کی نظروں میں امام علیہ السلام کی عظمت اس قدر بلند ہو چکی تھی کہ وہ امام کے سامنے اپنی نگاہوں کو نیچی رکھتا تھا۔ اور جب امام علیہ السلام اس کے قید خانہ سے باہر آئے تو امام حسن عسکری علیہ السلام کے متعلق اس کی بصیرت سب سے زیادہ تھی اور تمام لوگوں میں علی بن نارمش ہی وہ شخص تھا جو امام حسن عسکری علیہ السلام کی مدح و ستائش سب سے بہتر انداز میں کیا کرتا تھا۔[2]

(۵) لوگوں میں تفکر واستدلال کی قوت کو فروغ دینا

اسحاق کندی جو ایک عراقی فلسفی تھا اس نے تناقضاتِ قرآن (یعنی آیاتِ قرآنی ایک دوسرے کی ضد ہیں) کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اور اسے اس کتاب کو مرتب کرنے کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے گھر میں تنہائی کے عالم میں اس کتاب کی تدوین و تالیف میں مشغول ہو گیا۔

ایک دن اس کا ایک شاگرد امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو امام علیہ السلام نے اس سے یہ سوال کیا کہ: یہ بتاؤ کیا تم میں کوئی ایسا رشید، ہونہار، تعلیم یافتہ اور خداترس انسان نہیں ہے جو تمہارے استاد کو اس قسم کی کتاب تحریر کرنے سے روکے؟

۱۔ اصول کافی (جلد ۱) کتاب الحجۃ باب مولد ابی محمد الحسن بن علی، حدیث ۱، ص ۵۰۳-۵۰۶؛ ارشاد لمفید (جلد ۲) ص ۳۲۵-۳۲۱؛ اعلام الوری (جلد ۲) ص ۱۴۷؛ کمال الدین و تمام النعمۃ، ص ۶۸؛ کشف الغمۃ (جلد ۳) ص ۲۰۲؛ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۳۲۹

۲۔ اصول کافی (جلد ۱) ص ۵۰۸؛ کتاب الحجۃ باب مولد ابی محمد الحسن علی، حدیث ۸

تو اس شاگرد نے یہ عرض کیا کہ : ہم تو ان کے شاگرد ہیں۔آپ بتائیں آخر کس طرح ہم ان کے اس کام میں یا ان کے کسی اور کام میں ان پر اعتراض کر سکتے ہیں ؟تو امام علیہ السلام نے اس سے ایک اور سوال کیا: اچھا یہ بتاؤ جو کچھ میں تم سے کہوں گا تو کیا وہ تمام باتیں تم اپنے استاد سے نقل کر سکتے ہو ؟

تو اس نے جواب دیا : ہاں ! تو امام علیہ السلام نے اس سے کہا : اپنے استاد (اسحاق کندی) کے پاس جاؤ اور اس کے ساتھ محبت سے پیش آنا اور وہ جو کرنا چاہتا ہے اس میں اس کی مدد کرنا ! اور جب رفاقت و انسیت کا رابطہ بر قرار ہو جائے تو پھر یہ کہنا کہ میرے ذہن میں ایک سوال آیا ہے کیا میں آپ سے وہ سوال کر سکتا ہوں ؟ تو وہ تمہیں سوال کرنے کی اجازت دے دیگا للذا تم اس سے پوچھنا کہ : کیا یہ ممکن ہے کہ آیات قرآنی سے جن معانی و مفاہیم کو آپ نے درک کیا ہے متکلم قرآن کی مراد ان معانی و مفاہیم کے سوا کچھ اور ہی ہو ؟

تو وہ جواب دے گا کہ : ہاں ایسا ممکن ہے کہ میری مراد کچھ اور ہو اور خداوند متعال کی مراد کچھ اور تو تم اسی وقت یہ کہنا کہ : آپ کو کیسے معلوم کی آپ قرآنی آیات سے وہی معانی سمجھ رہے ہیں جو مراد متکلم قرآن ہے۔ہو سکتا ہے کہ قرآنی آیات سے جن معانی و مطالب کو آپ نے درک کیا ہے متکلمِ قرآن (خدا) نے ان آیات سے دوسرے معانی و مفاہیم کا ارادہ کیا ہو اور آپ ان الفاظ کو ان کے معنی مقصود میں استعمال نہ کر رہے ہوں ؟

امام علیہ السلام نے مزید ارشاد فرمایا کہ : وہ ایک ذہین انسان ہے لہٰذا یہی ایک سوال اسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے کافی ہوگا۔

شاگرد اپنے استاد کی خدمت میں پہونچا اور امام علیہ السلام کے حکم کے مطابق عمل کرتا رہا اور اپنے استاد کے ساتھ محبت و مہربانی سے پیش آتا رہا اور جب مکمل طور پر سوال و جواب کے لیے راستہ ہموار ہو گیا تو اس نے امام حسن عسکری علیہ السلام کے سوال کو اس انداز سے پیش کیا کہ :

کیا یہ ممکن ہے کہ آیات قرآنی سے جن معانی و مفاہیم کو آپ نے درک کیا ہے متکلمِ قرآن (یعنی خداوند متعال) کی مراد ان معانی و مفاہیم کے بر عکس ہو ؟

اسحاق کندی نے اپنے شاگرد کے سوال کو بڑے ہی غور سے سنا اور پھر اپنے شاگرد سے کہا : اپنے سوال کی تکرار کرو۔ جیسے ہی شاگرد نے اپنے سوال کی تکرار کی اسحاق کندی تفکر و تدبر کے دریا میں غرق ہو

گیا اور پھر اس نے کہا: ہاں یہ ممکن ہے کہ مراد متکلم کچھ اور ہو اور مخاطب مراد متکلم کے سوا کچھ اور ہی سمجھ رہا ہو۔

اسحاق کندی یہ جانتا تھا کہ اس کا شاگرد خود سے ایسے سوال پیش ہی نہیں کر سکتا لہٰذا اس نے اپنے شاگرد کو قسم دے کر کہا یہ بتا کہ یہ سوال تیرے ذہن میں کہاں سے آیا ہے اور اس سوال کا حقیقی منبع و ماخذ کون سی ہستی ہے؟ شاگرد نے کہا: جناب کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ سوال میرے ہی ذہن میں آیا ہو؟

استاد نے جواب دیا: "نہیں بلکہ اس سوال کا سرچشمہ کوئی عظیم ہستی ہے۔" شاگرد نے جواب دیا کہ ہاں اس سوال کا سرچشمہ ایک عظیم ہستی ہی ہے اور وہ ابو محمد امام حسن عسکری علیہ السلام کی ذات والا صفات ہے۔

استاد نے کہا کہ: ہاں اب تم حقیقت بیانی سے کام لے رہے ہو۔

وَ مَا كَانَ لِيَخْرُجَ مِثْلُ هٰذَا إِلَّا مِنْ ذٰلِكَ الْبَيْتِ ۔ ترجمہ: اس قسم کے سوالات صرف اسی خاندان سے صادر ہو سکتے ہیں اور یقیناً ایسے سوالات صرف اور صرف خاندان عصمت و طہارت کو ہی زیب دیتے ہیں۔

حقیقت کو درک کر لینے اور اپنی غلطی کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد اسحاق کندی نے آگ روشن کرنے کا حکم دیا اور تناقضات آیات قرآن (یعنی آیات قرآنی ایک دوسری کی ضد ہیں) کے متعلق لکھے ہوئے تمام نوشتوں کو اس نے نذر آتش کر دیا۔[1]

۶۔ اقتصادی کلچر کو فروغ دینا

زندگی میں صحیح حکمت عملی اقتصادی اور معاشی ترقی کا سبب ہے۔ اگر منصوبہ بندی درست ہو تو معاشرہ روز بہ روز ترقی کے منازل کو طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس بارے میں بھی امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیرت قابل توجہ نکات کی حامل ہے لہٰذا ہم ذیل میں اسی کے متعلق ایک داستان نقل کر رہے ہیں۔

محمد بن حمزہ سروری نقل کرتے ہیں کہ:

میں نے اپنے دوست ابو ہاشم جعفری کے ذریعہ ایک خط امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت

۱۔ المناقب (جلد ۳) ص ۵۲۵-۵۲۶؛ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۳۱۱ و جلد ۱۰، ص ۳۹۲

اقدس میں ارسال کیا اور آنحضرت سے درخواست کی کہ وہ یہ دعا کریں کہ خداوند متعال مجھے وسعت رزق عطا فرمائے اور مفلسی و تنگدستی سے نجات دے دے۔

وہ وقت بھی آیا کہ جب میں نے ابو ہاشم کے ذریعہ امام علیہ السلام کا جواب حاصل کیا تو آنحضرت نے اس خط میں کچھ اس طرح تحریر فرمایا تھا:

مَاتَ ابْنُ عَمِّکَ یَحیَ بْنَ حَمْزَۃَ وَ خَلَّفَ مِأَۃَ أَلْفِ دِرْہَمٍ وَ ہِیَ وَارِدَۃٌ عَلَیْکَ فَاشْکُرِ اللہ ‘وَ عَلَیْکَ بِالْإِقْتِصَادِ وَ اِیّاکَ وَ الْإِسْرَافَ فَاِنَّہُ مِنْ فِعْلِ الشَّیْطَنَۃِ ۔ترجمہ: تمہارے چچازاد بھائی یحی بن حمزہ کا انتقال ہو چکا ہے اور اس نے ایک لاکھ درہم میراث اور ورثہ کے طور پر چھوڑے ہیں اور یہ درہم (وراثت میں) تم تک منتقل ہونے والے ہیں لہٰذا اللہ کا شکر ادا کرو اور میانہ روی (کفایت شعاری) سے کام لو اور اسراف سے بچتے رہو کیوں کہ اسراف ایک شیطانی عمل ہے۔

کچھ دنوں کے بعد شہر حرّان سے ایک قاصد آیا اور میرے چچازاد بھائی کے سرمایہ سے مربوط جتنے بھی دستاویز تھے اس نے سب میرے حوالے کر دیئے۔ان دستاویز کے درمیان ایک خط تھا جسے پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے چچازاد بھائی یحی بن حمزہ کی وفات عین اسی دن ہوئی تھی جس دن امام علیہ السلام نے مجھے اس خبر سے آگاہ فرمایا تھا۔

امام علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق اس طرح میں تنگدستی اور مفلسی کی قید و بند سے آزاد ہو گیا اور الٰہی حقوق کو ادا کر لینے اور برادران دینی کے ساتھ احسان کرنے کے بعد حکم امام کے مطابق میں نے اپنی زندگی کو کفایت شعاری اور میانہ روی پر منظّم کر لیا۔اگر چہ ماضی میں میں ایک فضول خرچ اور مسرف انسان تھا۔

۷۔ تقیہ کے بارے میں تاکید

امام حسن عسکری علیہ السلام نہضت اسلامی کے تحفظ اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی ثقافت کو فروغ دینے کے لئے مختلف راہ و روش سے استفادہ کیا کرتے تھے۔چونکہ امام حسن عسکری علیہ السلام عباسی ظالم و جابر سلاطین کے دور حکومت میں زندگی بسر کر رہے تھے اور مذہب تشیع اور اس کے پیروکاروں (یعنی شیعوں) کے متعلق بڑے خطرات سے آگاہ و باخبر تھے لہٰذا ہمیشہ اپنے شیعوں اور پیروکاروں کو تقیہ پر عمل

کرنے کی نصیحت فرمایا کرتے تھے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِيْ شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقَاةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ وَ إِلَى اللهِ الْمَصِيْرُ۔ ترجمہ: خبر دار صاحبان ایمان مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سرپرست نہ بنائیں اور جو بھی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی بھی تعلق اور رابطہ نہیں ہوگا مگر یہ کہ تمہیں کفار سے خوف ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے اور خدا تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے (کیوں کہ وہ غفور و رحیم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قہّار اور عزیز بھی ہے) اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[1]

مذکورہ آیت تقیہ کے بارے میں ہے اور اسی آیت کے مطابق امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے شیعوں کو تقیہ کرنے کی نصیحت فرمایا کرتے تھے اور اس طرح اپنے شیعوں کی جان و مال کا تحفظ کیا کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت قابل ملاحظہ ہے: حلبی (امام حسن عسکری علیہ السلام کے عقیدت مندوں میں سے ایک) یہ نقل کرتے ہیں کہ: ہم شہر سامراء کے عسکر نامی محلے میں اکٹھا ہو کر امام حسن عسکری علیہ السلام کی (تشریف آوری) کے منتظر تھے۔ کیوں کہ یہ دن امام علیہ السلام کے گھر سے باہر آنے کا دن تھا تبھی آنحضرت کا ایک خط ہمیں موصول ہوا جس میں امامؑ نے کچھ اس طرح تحریر فرمایا تھا:

أَلَا لَا يُسَلِّمَنَّ عَلَيَّ أَحَدٌ وَ لَا يُشِيْرُ إِلَيَّ بِيَدِهٖ وَ لَا يُوْمِئُ فَإِنَّكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ۔ ترجمہ: آگاہ ہو جاؤ کہ اس صورت حال میں تم میں سے کوئی بھی مجھے سلام نہ کرے اور اپنے ہاتھ اور سر سے میری طرف اشارہ بھی نہ کرے کیوں کہ تمہاری جان خطرہ میں ہے۔[2]

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۲۸

۲۔ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۶۹؛ الخرائج والجرائح (جلد ۱) ص ۴۳۹

۸۔ معاشرہ میں آل محمد علیہم السلام کے مقام و منزلت کی دلیلیں

ابو ہاشم بیان کرتے ہیں کہ: میں نے امام حسن عسکری علیہ السلام سے سوال کیا کہ اے میرے سید و سردار اس آیت کریمہ کی تفسیر کیا ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِ نَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ۔

ترجمہ: پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان افراد کو بنایا کہ جنہیں خود ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کر لیا کہ ان میں سے بعض اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض اعتدال پسند ہیں اور بعض خدا کی اجازت سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اور در حقیقت یہی بہت بڑا فضل و شرف ہے۔[1]

تو امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ:

"آیت میں مذکور ان تینوں گروہوں کا تعلق آل محمد سے ہے۔ ان میں سے جس نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو وہ وہی شخص ہے جس نے امام کا اقرار نہیں کیا ہے اور ان میں سے مقتصد وہ ہے جو مقام امامت کو پہچانتا ہے اور تیسرا وہ گروہ جو فضل و شرف کے حصول میں سبقت کرنے والا ہے خود معصوم ائمہ ہیں۔"

ابو ہاشم بیان کرتے ہیں کہ: میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کتنی عظیم فضیلت ہے جو اللہ نے آل محمد علیہم السلام کو عطا فرمائی ہے اور یہ سوچ کر کچھ دیر اشک بہاتا رہا۔ تبھی امام حسن عسکری علیہ السلام میری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ: تم جو آل محمد کی عظمت کے بارے میں غور و فکر کر رہے ہو آل محمد اس سے کہیں بلند و برتر ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم ان افراد میں سے ہو جو دامن اہلبیت علیہم السلام سے متمسک ہیں اور جب قیامت کے دن دوسرے لوگوں کو ان کے رہبر و رہنما کے ساتھ بلایا جائے گا تو تم خیر پر ہو گے اور اہلبیت علیہم السلام کے پیروکاروں میں ہو گے۔[2]

۱۔ سورہ فاطر، آیت ۳۲

۲۔ قطب الدین راوندی، الخرائج والجرائح (جلد ۲) ص ۶۸۷؛ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۵۸ ـ ۲۵۹؛ کشف الغمۃ (جلد ۳) ص ۲۱۵

۹۔ تولی و تبری کا اہتمام

معاشرتی (سماجی) نقطۂ نظر سے بھی امام حسن عسکری علیہ السلام کی عملی سیرت ان کے پیروکاروں کے لئے شائستہ اور عالی نکات کی حامل ہے۔ آنحضرت کی معاشرتی زندگی کا ایک سب سے اہم اصول یہ تھا کہ آپ تولی و تبری پر بہت ہی زیادہ توجہ دیا کرتے تھے۔ اور متعدد مقامات میں یہ چیزیں دیکھنے میں بھی آئی ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے شیعوں کو اہلبیت علیہم السلام سے محبت کرنے اور دشمنان اہلبیت سے بیزاری کا حکم دیا کرتے تھے۔

مثال کے طور پر ایک دن علی بن عاصم کوفی (جو ایک نابینا تھے) امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے سلام و جواب کے بعد امام علیہ السلام سے گفتگو کرنے کے درمیان انہوں نے خاندان نبوت سے اپنی مخلصانہ اور والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بیان کیا کہ:

میں اپنے دست قدرت سے آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہوں آپ کی محبت و ولایت، آپ کے دشمنوں سے نفرت و بیزاری اور خلوت میں ان پر لعنت کرنے کے سوا میں اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ان سب کے باوجود آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں محبت و مودت کے کس مرحلہ میں ہوں؟

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ:

میرے والد بزرگوار نے میرے جد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس روایت کو نقل فرمایا ہے کہ:

مَنْ ضَعُفَ عَلَى نُصْرَتِنَا أَهْلَ الْبَيْتِ وَ لَعَنَ فِي خَلَوَاتِهِ أَعْدَاءَنَا بَلَّغَ اللهُ صَوْتَهُ إِلَى جَمِيعِ الْمَلَائِكَةِ۔۔۔فَإِذَا بَلَغَ صَوْتُهُ إِلَى الْمَلَائِكَةِ اسْتَغْفَرُوْا لَهُ وَأَثْنَوَاعَلَيْه ۔

ترجمہ: جو شخص ہم اہل بیت کی مدد کرنے سے قاصر ہے اور تنہائیوں میں (مخفیانہ طور پر) ہمارے دشمنوں پر لعنت بھیجتا ہے تو خداوند عالم اس کی آواز کو تمام فرشتوں تک پہونچاتا ہے اور جب اس کی آواز فرشتوں تک پہونچتی ہے تو وہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں اور اس کی مدح و ستائش کرتے ہیں۔

امام حسن عسکریؑ مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ:

تمام فرشتے اس شخص کے حق میں اس طرح دعا کرتے ہیں: اَللهُمَّ صَلِّ عَلَى رُوْحِ عَبْدِکَ هٰذَ الَّذِی بِذَلَ فِی نُصْرَةِ اَوْلِيَائِه جُهْدَهُ وَلَوْقَدَرَ عَلَى أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِکَ لَفَعَلَ ۔

ترجمہ: اے اللہ! اپنے اس بندے کی روح پر رحمت نازل کر جس نے اپنے اولیاء کی نصرت میں اپنی تمام تر کوششوں کو صرف کر دیا ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ کچھ اور کر سکتا تو ضرور کرتا۔

تبھی خداوند عالم کی طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ اے میرے فرشتوں! میں نے اپنے اس بندہ کے حق میں تمہاری دعاؤں کو قبول کر لیا اور میں نے اس کی روح پر رحمتیں نازل کر دیں اور اس کی روح کو ابرار اور اپنے بہترین بندوں کی ارواح کے ہم ردیف قرار دیا۔[1]

۱۰۔ شبہات کا جواب دینا

امام حسن عسکری علیہ السلام کی معاشرتی زندگی کا ایک اہم پہلو معاشرہ کے ثقافتی اور دینی شبہات کا جواب دینا تھا۔ ابو ہاشم بیان کرتے ہیں کہ: ایک دن ابو بکر فہفکی نے امام حسن عسکری علیہ السلام سے یہ سوال کیا کہ: آخر کیوں ایک بے بس اور لاچار عورت کو میراث کا ایک حصہ اور مرد کو دو حصہ دیا جاتا ہے؟ امام علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا:

قَالَ: لِئَنَّ الْمَرْأَةَ لَيْسَ لَهَا جِهَادٌ وَلَا نَفَقَةٌ وَ لَا عَلَيْهَا مَعْقُلَةٌ اِنَّمَا ذٰلِكَ عَلَى الرِّجَالِ۔ ترجمہ: کیوں کہ جہاد، نان و نفقہ اور قتل خطا کی دیت ادا کرنا عورتوں کے ذمہ نہیں ہے بلکہ یہ سب مردوں کے ذمہ ہے۔

ابو ہاشم جعفری نقل کرتے ہیں کہ: میں نے خود سے یہ کہا کہ اس سے پہلے بھی میں نے سنا تھا کہ ابن ابی العوجاء نے امام صادق علیہ السلام سے یہی سوال کیا تھا اور انہوں نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ میرے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام میری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ:

نَعَمْ هٰذِهِ مَسْأَلَةُ ابْنِ اَبِی الْعَوْجَاءِ وَ الْجَوَابُ مِنَّا وَاحِدٌ اِذَا كَانَ مَعْنَى الْمَسْأَلَةِ وَاحِدًا جَرَى لِآخِرِنَا مَا جَرَى لِاَوَّلِنَا وَ اَوَّلُنَا وَ آخِرُنَا فِی الْعِلْمِ وَ الْاَمْرِ سَوَاءٌ وَ لِرَسُولِ اللهِ وَ الامِيْرِ الْمؤْمِنِيْنَ فَضْلُهُمَا ، ترجمہ: ہاں یہ سچ ہے کہ یہ ابن ابی العوجاء کا سوال ہے چونکہ

۱۔ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۳۱۶-۳۱۷

سوال وہی تھا لہٰذا ہمارا جواب بھی وہی ہے (جو میرے جد امام صادقؑ نے دیا تھا) ہمارے اول و آخر (سب کے سب) علم اور امر امامت و خلافت میں یکساں اور برابر ہیں۔اور حضرت رسول خداؐ اور امیر المومنینؑ کی اپنی خوبیاں ہیں اور ان کے خود اپنے مخصوص فضائل و کمالات ہیں۔[1]

۱۱۔ علمائے ربّانی کی حوصلہ افزائی

ائمہ اطہار علیہم السلام کی جانب سے علماء ربانی اور پر عزم مفکرین کی حوصلہ افزائی اور حمایت نے اہلبیت علیہم السلام کی بے نیاز (غنی) اور ترقی پسند ثقافت کو نشر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔خورشید امامت مولا امام حسن عسکری علیہ السلام شیعہ ثقافتی شخصیات کی قدر کرتے ہوئے، علماء اور علم دوست افراد کے دلوں کو امید کی کرن سے سرشار و لبریز کر دیا کرتے تھے۔ابو ہاشم جعفری جو امام حسن عسکری علیہ السلام کے ایک حقیقی صحابی اور جناب جعفر طیار کے نبیروں میں سے تھے، نقل کرتے ہیں کہ:

ایک دن میں نے یونس بن عبد الرحمٰن کی تالیف کردہ (یوم ولیلہ) نامی کتاب کو امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت اقدس میں پیش کیا تو مطالعہ کے بعد آنحضرت نے مجھ سے یہ پوچھا کہ:

یہ کتاب کس کی تحریر کردہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: مولا! یہ کتاب یونس بن عبد الرحمٰن کی تصانیف میں سے ایک ہے تو امام حسن عسکری علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَعْطَاهُ اللّٰهُ بِكُلِّ حَرَفٍ نُوْراً يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ ترجمہ: خداوند عالم ہر اک لفظ کے بدلے قیامت کے دن اسے نور (روشنی) عطا کرے گا۔[2]

اور اسی طرح امام حسن عسکری علیہ السلام نے علی بن بابویہ قمیؒ (جو قم کے ممتاز شیعہ علماء میں سے ایک تھے) کی بھی ایک خط میں شائستہ اور بہترین الفاظ کے ذریعہ تعریف و ستائش کی ہے۔

امام علیہ السلام اپنے خط میں کچھ اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ:

۱۔ پیشوای یازدہم، ص ۲۴ ـ۲۵؛ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۵۵ ـ۲۵۶؛ مناقب آل ابی طالب (جلد ۳) ص ۵۳۶؛ الکافی (جلد ۷) ص ۸۵

۲۔ رجال نجاشی، ص ۴۴۷

'' اَمَّا بَعْدُ : اَوْصِیکَ یَا شَیْخِی وَ مُعْتَمَدِی وَ فَقِیْهِی أَبَالْحَسَنِ عَلِیَّ بْنَ الْحُسَیْنِ الْقُمِّی! وَفَّقَکَ اللّٰهُ لِمَرْضَاتِهٖ وَجَعَلَ مِنْ صُلْبِکَ اَوْلَادًا صَالِحِیْن بِرَحْمَتِهٖ ... فَاعْمَلْ بِوَصِیَّتِی وَأْمُرْ جَمِیْعَ شِیْعَتِی بِمَا أَمَرْتُکَ بِهٖ حَتّٰی یَعْمَلُوْا عَلَیْهِ وَ عَلَیْکَ بِالصَّبْرِ ۔ترجمہ: اے میرے محترم' قابل اعتماد فقیہ ابوالحسن علی بن حسین قمی! اللہ آپ کو اپنی رضا کے حصول کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی رحمت کے ذریعہ آپ کے صلب میں نیک اور صالح اولاد قرار دے...آپ میری وصیت پر عمل کریں اور میرے تمام شیعوں کو ان چیزوں کا حکم دیں جن چیزوں کا میں نے آپ کو حکم دیا ہے تاکہ وہ بھی ان چیزوں پر عمل کریں اور خود بھی صبر کریں اور میرے شیعوں کو بھی صبر کا حکم دیں۔

یقیناً زمین خداوند عالم کی ملکیت ہے کہ جس کا وارث وہ اپنے بندوں کو بنائے گا اور عاقبت بخیری پرہیزگاروں کے لئے ہے اور تم پر' اور میرے تمام شیعوں پر خدا کی رحمت اور اس کا درود وسلام ہو۔[1]

۱۲۔ معتبر اور قابل اعتماد افراد کے ساتھ رازدارانہ تعلق قائم کرنا

سیاسی شدید دباؤ اور فوجی علاقوں میں اجباری اقامت اور دشمنوں کے زیر نگرانی ہونے کے باوجود بھی' امام حسن عسکری علیہ السلام نے (اپنی دور اندیشی کی بدولت) اپنے شیعوں کے ساتھ نہایت ہی عمیق رابطہ برقرار کیا تھا۔ مثال کے طور پر:

امام حسن عسکری علیہ السلام نے ایک دن داؤد بن اسود کو بلا کر انہیں ہتھیلی کی سائز کی ایک لمبی اور گول لکڑی دی اور یہ حکم دیا کہ وہ اس لکڑی کو عثمان بن سعید عمری (جو امام حسن عسکری علیہ السلام کے نزدیک قابل اعتماد اور امام مہدی علیہ السلام کے پہلے نائب خاص تھے) تک پہونچا دیں۔

داؤد بن اسود بیان کرتے ہیں کہ:

میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کی غرض سے نکلا۔ راستہ میں میری ملاقات ایک ایسے سقّا سے ہوئی جس کے خچر نے راستہ روک رکھا تھا لہٰذا خچر کو ہٹانے کے لئے میں نے وہ لکڑی اٹھائی اور جیسے ہی خچر کو مارا وہ لکڑی شگافتہ ہو گئی۔ اب جو میری نظر لکڑی کے شگافتہ حصہ پر پڑی تو میں نے اس میں

۱۔ انوار البھیۃ، ص ۳۱۹ ـ ۳۲۰، بھجۃ الآمال (جلد ۵) ص ۴۱۹

کچھ خطوط دیکھے جو بہت ہی حفاظت سے رکھے گئے تھے لہٰذا میں نے اس لکڑی کو اپنی آستین میں چھپالیا اور ادھر سقّا نے شور و غوغا مچا دیا تھا اور میری اور میرے آقا کی مسلسل توہین کر رہا تھا اور دشنام آمیز کلمات اس کے ورد زباں تھے۔

مشن پورا کرنے کے بعد جب میں امام علیہ السلام کے گھر کے قریب پہونچا تو امام علیہ السلام کے خدمت گذاروں میں سے عیسیٰ نامی خدمت گذار نے میرا استقبال کرتے ہوئے مجھ سے یہ کہا کہ :

میرے سید و سردار تجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ آخر کیوں تم نے خچر کو مارا اور آخر کیوں ایسا عمل انجام دیا جس سے لکڑی ٹوٹ گئی ؟ دوبارہ کبھی بھی کوئی ایسا عمل انجام نہ دینا جس کے سبب تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت پڑ جائے اور غلطیاں دہرانے سے گریز کرو۔اور اگر کسی کو ہماری شان میں گستاخی کرتے ہوئے یا ہمارے بارے میں دشنام آمیز کلمات کہتے ہوئے سنو تو توجہ نہ دو اور نہ ہی اپنا تعارف کراؤ کیوں کہ ہم اس سرزمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں کہ جس کے حکمران ظالم و جابر اور بد اخلاق و بد اطوار ہیں لہٰذا اپنا راستہ چلتے رہو اور یہ جان لو کہ تمہاری تمام تر خبریں ہم تک پہونچ رہی ہیں اور ہم تمہارے حالات سے واقف ہیں۔[1]

۱۳۔زمانہ کے خطرناک بحران سے معاشرہ کو نجات دینا

مورخین بیان کرتے ہیں کہ ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب شہر سامراء میں ایک شدید قحط پڑا۔وقت کے حاکم معتمد نے لوگوں کو نماز استسقاء (طلب باران کی نماز) پڑھنے کا حکم دیا۔لوگ مسلسل تین دن تک نماز استسقاء پڑھتے رہے اور قنوت میں طلب باران کی دعائیں کرتے رہے لیکن بارش نہیں ہوئی۔چوتھے دن جاثلیق (عیسائی پادریوں کا پیشوا اور مقتدا) عیسائیوں اور راہبوں کے ہمراہ صحرا میں پہونچا۔انہیں میں سے ایک ایسا راہب بھی تھا جو جب بھی اپنے ہاتھ کو آسمان کی طرف بلند کرتا تھا تو موسلا دھار بارش ہونے لگتی تھی۔

اگلے دن بھی جاثلیق عیسائیوں اور راہبوں کے ہمراہ صحرا میں پہونچا اور جب اس مخصوص راہب نے اپنے ہاتھ کو آسمان کی طرف بلند کیا تو اس قدر بارش ہوئی کہ اب لوگ بارش کے خواہشمند اور متقاضی

۱۔ مناقب آل ابی طالب (جلد ۳) ص ۵۲۸ ــ۵۲۹ ؛ بحار الانوار (جلد ۵۰) ص ۲۸۳ ؛ مستدرک الوسائل (جلد ۱۲) ص ۲۱۳

نہ تھے۔ عیسائیوں کا یہ عمل حیرت و تعجب کا پھندا اور شکوک و شبہات کا شکنجہ بن چکا تھا لہٰذا بعض مسلمان دین مسیحیت کی طرف راغب ہو گئے اور اس طرح اسلامی معاشرہ ایک خطرناک بحران کی زد میں آ گیا۔

یہ بات وقت کے حاکم پر بڑی شاق اور ناگوار گذری (کیوں کہ حاکم وقت معتمد نے اپنی حکومت کو خطرہ میں دیکھ لیا تھا) لہٰذا اس نے صالح بن وصیف کو حکم دیا کہ وہ قید خانہ جائے اور ابو محمد حسن بن علی علیہم السلام کو اپنے ہمراہ قید خانہ سے باہر لائے۔

جب امام حسن عسکری علیہ السلام معتمد کے پاس آئے تو اس نے امام علیہ السلام سے یہ عرض کیا کہ: اے ابو محمد اپنے جد حضرت رسول خداؐ کی امت کی امداد کو پہونچئے کیوں کی وہ منحرف ہو چکی ہے اور ضلالت و گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ:

"اے معتمد! جاثلیق سے کہو وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کل بھی صحرا جائے۔

معتمد چونکہ امام کے مقصد سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس نے سوال کیا کہ: اب جب لوگ بارش کے خواہشمند نہیں ہیں تو پھر صحرا جانے کا فائدہ کیا ہے؟"

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"اس لئے تاکہ میں شک و شبہہ کو بر طرف کر دوں اور ضلالت و گمراہی کی وادیوں میں بھٹکنے والے افراد کو راہِ راست اور حق کی ہدایت کر دوں۔ حاکم وقت کے حکم سے جاثلیق عیسائیوں اور پادریوں کے ہمراہ صحرا پہونچا اور ادھر محافظ دین و شریعت امام حسن عسکری علیہ السلام اس عالم میں صحرا پہونچے کہ آپ کے ہمراہ ایک جمع غفیر تھا۔"

اب جیسے ہی عیسائیوں اور راہبوں نے طلب باران کے لئے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کیا تو گھٹائیں چھا گئیں اور سحاب رحمت جھوم جھوم کر برسنے لگا۔ تبھی امام علیہ السلام نے کچھ افراد کو یہ حکم دیا کہ وہ فلاں راہب کا ہاتھ پکڑ لیں اور اس کی انگلیوں کے درمیان جو کچھ ہے اسے باہر نکال لیں۔

حکم امام علیہ السلام کے مطابق جب لوگوں نے تلاشی لی تو اس کے انگلیوں کے درمیان آدمی کی ہڈی ملی۔ امام علیہ السلام نے ہڈی کو ایک کپڑے میں لپیٹنے کے بعد راہب کو حکم دیا کہ اب وہ طلب باران کے لئے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کرے۔

راہب نے جو اس بار اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا تو بادل چھٹ گئے اور حق و حقانیت کا سورج فلک پر نمودار ہو گیا۔ لوگ حیران و پریشان تھے تبھی معتمد نے امام حسن عسکری علیہ السلام سے سوال کیا کہ: اس ہڈی کی حقیقت کیا ہے؟

تو امام علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

"یہ ایک نبی کی ہڈی ہے اور انبیاء الٰہی کی ہڈیوں میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ جب بھی نبی کی ہڈی کھلے آسمان کے سامنے ظاہر ہو گی گھٹائیں چھا جائیں گی اور بارش ہونے لگے گی۔"

امام علیہ السلام کی تعریف و تحسین کے بعد جب لوگوں نے اس ہڈی کی آزمائش کی تو بالکل ویسا ہی ہوا جیسا کہ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا۔[1]

☆☆☆

۱۔ شرح احقاق الحق جلد ۱۲، صفحہ ۴۶۴ ـ ۴۶۵؛ الفصول المہمۃ فی معرفۃ ائمۃ، ابن صباغ جلد ۲، صفحہ ۱۰۸۵؛ پیشوای یازدہم صفحہ ۲۲

منابع و مآخذ

- ابن ابی الفتح الاربلی، کشف الغمۃ، دار الاضواء، بیروت، لبنان ۱۴۰۵ھ
- ابن الصباغ، الفصول المھمۃ (جلد ۲)، دار الحدیث للطباعۃ والنشر، قم، ۱۴۲۲
- ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، المطبعۃ الحیدریۃ، نجف، ۱۳۷۵ھ
- حسین ابن عبد الوھاب، عیون المعجزات، المطبعۃ الحیدریۃ، نجف، ۱۳۶۹
- سید مرعشی، شرح احقاق الحق (جلد ۱۲)، مکتبۃ آیۃ اللہ العظمیٰ المرعشی النجفی، قم
- شیخ صدوق، کمال الدین و تمام النعمۃ، موسسۃ النشر الاسلامی، قم، ۱۴۰۵
- شیخ طبرسی، اعلام الوری (جلد ۲)، موسسۃ آل البیت علیہم السلام لاحیاء التراث، قم، ۱۴۱۷ھ
- شیخ طوسی، الغیبۃ، موسسۃ المعارف الاسلامیۃ، قم ۱۴۱۱ھ ق
- شیخ عباس قمی، انوار البھیۃ، موسسۃ النشر الاسلامی، قم، ۱۴۱۷ھ ق
- شیخ علی نمازی شاھرودی، مستدرک سفینۃ البحار (جلد ۹)، موسسۃ النشر الاسلامی، قم، ۱۴۱۹
- شیخ کلینی، اصول کافی، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، ۱۳۶۳
- شیخ مفید، الارشاد (جلد ۲)، موسسۃ آل البیت علیہم السلام لاحیاء التراث، قم، ۱۴۱۴
- علامہ مجلسی، بحار الانوار (جلد ۵۰)، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۰۳ھ
- قطب الدین الراوندی، الخرائج والجرائح، موسسۃ الامام المھدی، قم، ۱۴۰۹
- المیرزا النوری، مستدرک الوسائل (جلد ۳)، موسسہ آل البیت لاحیاء التراث، بیروت، لبنان
- نجاشی، رجال نجاشی، موسسۃ النشر الاسلامی، قم، ۱۴۱۶
- وفیات الائمہ، من علماء البحرین والقطیف، دار البلاغۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان، ۱۴۱۲

انسانی کرامت کے بنیادی اصول، ملا صدرا کی نظر میں

مؤلف: فتانہ درتاج، محمد محمد رضائی
مترجم: ڈاکٹر فیضان جعفر علی

ملا صدرا کے فلسفی اصول و مبانی کے اعتبار سے انسانی کرامت (Dignity) ایک حقیقی اور وجودی امر ہے اعتباری اور قراردادی امر نہیں ہے۔ چونکہ وجود کے مراتب و درجات ہوتے ہیں لہٰذا کرامت کے بھی مراتب ہیں۔ اس لحاظ سے انسان ذاتی طور پر صاحب کرامت ہے یعنی تکوینی نظام میں اور انسانی فطرت کے ساتھ کرامت کا ایسا تعلق ہے جو ثابت اور ناقابل تبدیل ہے کیونکہ انسان کو عقل و خرد، نفخۂ روح جیسی خصوصیات عطا کی گئی ہیں لیکن انسان بلندی کے راستوں کو اپناتے ہوئے ایک وسیع و بلند دنیا تک رسائی حاصل کرسکتا ہے اور قدسی عقل سے متصل ہو کر انسانی کرامت کو دستیاب کرسکتا ہے۔البتہ اکتسابی کرامت کے مراتب کا حصول بھی علم و معرفت، ایمان، تقویٰ اور تعقل کے ساتھ ہی میسر ہے۔ لہٰذا ملا صدرا کی نگاہ میں انسانی وقار و کرامت ایک ایسا امر ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو انسان اور دوسرا پہلو ملکوت ہے۔ انسان ہی تنہا ایک ایسی حقیقت ہے جو جسمانی مرتبہ سے روحانی مقام کے حصول تک کا سفر طے کرسکتا ہے۔

مفکرین، دانشوروں اور عرفاء کے یہاں انسان کی شناخت، ایک اہم موضوع رہا ہے کیونکہ انسان بہت ہی پیچیدہ مخلوق ہے جس کی حقیقت کو موجودہ علمی ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی آسانی سے نہیں سمجھا جاسکتا۔

ملا صدرا (۹۷۹۔۱۰۵۰ھ ق) ایک ایسے مفکر ہیں جنہوں نے اس موضوع کو سمجھا اور اس بارے میں بہت سی جامع و مانع کتابیں تحریر کی ہیں۔ انھوں نے انسان کی وجودی شان پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق انسان تمام ممکنات کے برخلاف، ایک خاص ماہیت اور وجودی مرتبہ کا حامل ہے۔ اس کا

وجودی مرتبہ ثابت نہیں ہے بلکہ ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ میں منتقل ہو جاتا ہے اور ہر وقت وہ ترقی و تکامل کی حالت میں رہتا ہے۔ ملا صدرا کی نگاہ میں انسانی وقار و کرامت کا تعلق اس کے وجود، اس کے فطری و ذاتی حق سے ہے لیکن طول تاریخ میں بالخصوص نشاۃ ثانیہ کے بعد انسانی کرامت جیسے موضوعات سے غفلت برتی گئی اور ہیومنزم (Humanism)، انسان کی اقتدار و کامیابی اور فطرت پر اس کے تسلط جیسے نظریے مغربی فلسفیوں کی توجہ کا مرکز قرار پائے۔

لیکن ملا صدرا کا اعتقاد ہے کہ انسان ہی تنہا ایسی عقلمند مخلوق ہے جس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ حقائق کے ساتھ معنوی اتحاد کو فراہم کر سکے اور دنیائے ہستی کی بہ نسبت دنیائے عقلی کا مشاہدہ کر سکے۔ انسان ذاتی کرامت و وقار کے علاوہ اکتسابی وقار و کرامت کو بھی پا سکتا ہے لیکن یہ کرامت علم و معرفت، عقل و خرد، ایمان و تقوا وغیرہ جیسے عناصر کی موجودگی کی صورت ہی میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

لیکن ہماری تحقیق کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ملا صدرا کے طرز تفکر میں انسانی کرامت و وقار کو کس طرح پرکھا ہے؟ اس تحقیق کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر جستجو کرنے کے لیے مندرجہ ذیل سوالات کیے گئے ہیں:

الف: کرامت کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟
ب: ملا صدرا کی نگاہ میں انسانی کرامت کے مبانی و اصول کیا ہیں؟
ج: ملا صدرا کی نظر میں انسانی کرامت کی کتنی قسمیں ہیں؟
د: ملا صدرا کی نگاہ میں ذاتی اور اکتسابی کرامت کے لوازمات و ضروریات کیا ہے؟

اس تحقیق میں معتبر مصادر کا سہارا لیتے ہوئے بحث و گفتگو کی جائے گی لیکن موضوع کی ماہیئت کو مد نظر رکھتے ہوئے کتابخانوں اور اسناد جیسے تحقیقی طریقہ کا سہارا لیا جائے گا اور نتائج کے اخذ کرنے کی صورت میں تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

موضوع سے متعلق ہونے والی گذشتہ تحقیقات

آج کا انسان جو ہمیشہ سے زیادہ بشریت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور وہ اپنی زندگی کی اہمیت کا ان عناصر کے سبب معتقد ہے جو اس کی شان و کرامت کے تعین میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں، اسی وجہ سے اس پر خاص توجہ رکھتا ہے۔

اگرچہ انسانی کرامت کے نظریے کو نشاۃ ثانیہ کے دور کا نتیجہ مانا جاتا ہے[۱] لیکن تاریخی اطلاعات کے مطابق، نظامِ ہستی میں انسان کے مقام و منزلت کو سوفسطائیوں کے ظہور سے ہی توجہ کا مرکز قرار دیا گیا ہے اور گذشتہ زمانے سے ہی اس کی مختلف تعریف کی گئی ہے۔ ان کی نظر میں انسان ایک ایسی آزاد اور صاحب اختیار موجود و مخلوق ہے جو اپنی سرنوشت کو تبدیل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں انسانیت و ہیومنزم کا نظریہ وجود میں آیا اور مستقبل میں جا کر اس نے ایک عظیم تاریخ رقم کرلی[۲]۔

افلاطون نے اس خیال سے بالاتر ہو کر پہلی بار اپنے فلسفے میں ماورائے دنیا اور نفس پر ایک غیر معمولی چیز کے طور پر زور دیا ہے[۳]۔ وہ انسان کی لیے ایک خاص شان و منزلت کا قائل تھا اور اس نے اس مسئلہ کے لیے میدان بھی فراہم کر دیا۔

سقراط نے بھی سوفسطائیوں کا ہمعصر قرار دیتے ہوئے انسان کو ان تمام چیزوں کا اصلی مرکز قرار دیا ہے جس کے بارے میں فکر کرنا اہمیت کا حامل ہے[۴]۔

ارسطو بھی عقل کو ایک ایسا عامل قرار دیتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان الٰہی حیات کو پا سکتا ہے۔ قدیم یونانی مکتوب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حکماء اس بات کے معتقد تھے کہ انسان ایک صاحب کرامت موجود ہے۔

سیسرو (Cicero) (۱۰۶۔۴۳ق م) کی تالیفات میں انسان ہونے کو خاص اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے اور کرامت کو انسان کا ذاتی و فطری حق قرار دیا گیا ہے لیکن قرون وسطیٰ میں اس مسئلہ نے دوسری شکل اختیار کرلی اور تمام انسانی زندگی کو ایک بلند پہلو کے ارتباط کے ساتھ دیکھا جانے لگا یعنی ایسا تصور جو انسان کے استقلال کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے دور میں پورے طور پر بدل گیا اور انسان ہی کو تمام ہستی کا محور و مرکز متعارف کیا گیا لیکن اس نے اپنے انسانی مراتب سے دوری اختیار کی[۵]۔

۱۔ بایر تنز، کورت، ایدہ کرامت انسانی، ص، ۱۱۵

۲۔ یگر، ورنر، پایدیا، ص ۴۰۵

۳۔ افلاطون، دورہ کامل آثار افلاطون (ج ۸)، ص ۴۵۱

۴۔ فراست، اسماعیل، درس ہای اساسی فلاسفہ بزرگ،، ص ۸۷

۵۔ محمد پور دہکردی، سیما، کرامت انسان از دیدگاہ ملا صدرا و کانت، ص ۲۱۱ تا ۲۱۲

اسلامی دنیا میں بھی انسانیت اور علم النفس جیسے موضوع کو بو علی سینا[۱]، فارابی، سہر وردی، ملا صدرا وغیرہ جیسے بڑے فلسفیوں نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے انسان کی ذاتی کرامت کو انسان کی الٰہی شان و منزلت پر توجہ کے ساتھ مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ملاصدرا نے بھی اس مسئلہ کو اہمیت دیتے ہوئے گفتگو کی ہے۔انھوں نے اپنے خاص طرز بیان کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے جس کے بارے میں ہم اس مضمون میں تبصرہ کریں گے۔

ملاصدرا کا نظریہ بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کرامت کے لغوی و اصطلاحی معنی سے آگاہ ہو جائیں۔اس بات پر توجہ کے ساتھ کہ لغوی معنی کے ذریعہ ہم شاید کرامت کے مفہوم کا عمیق تجزیہ پیش کر سکیں لہٰذا اس کے بعض معنی کی طرف اشارہ کریں گے۔

کرامت کے معنی

الف: کرامت کے لغوی معنی: لفظ کرامت کا اسم مصدر کَرُم ہے جس کے معنی بزرگواری، بخشندگی اور جود و سخاوت کے ہیں۔ کرم کے معنی یا نفسانی شرافت کے ہیں یا اخلاقی شرافت کے معنی میں ہے[۲]۔ جب کرم کو انسان کے ساتھ توصیف کیا جائے گا تو اس کا معنی اچھا اور قابل تعریف کردار ہوگا جو انسان کے فعل کے ذریعہ ظاہر ہو اور اچھائیوں کے علاوہ اس کا کسی چیز پر اطلاق نہ ہو[۳]۔ کریم اس کو کہتے ہیں جو مختلف قسم کی نیکیوں، فضائل کا حامل ہو اور ایسی صفت رکھتا ہو جو عقل کو راضی کرلے اور انسان کو حمد و ستایش کے لیے مجبور کردے۔ایسی عزت و بزرگی خداوند عالم کی جانب سے انسان کو دی گئی ہوتی ہے[۴]۔

کرم ایک ایسی صفت ہے جو مختلف شرف و فضیلت کا حامل ہوتی ہے اور کریم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے اندر تمام اوصاف حمیدہ جمع ہو جائیں جس کا متضاد لئیم ہے[۵]۔ عربی لفظ ''کرامہ'' (Dignity) کو فارسی میں شرافت، فضیلت، شان، عزت، مقام و منزلت کے معنی استعمال کیا جاتا ہے۔اس لیے صاحبِ

۱۔ رجوع کریں: ابو علی سینا، اشارات، نمط سوم؛ سہر وردی، مجموعہ مصنفات (ج۱)؛ فارابی، رسالہ عقل

۲۔ ابن فارس، ابی الحسین احمد، معجم المقاییس اللغۃ (ج۲) ص ۱۸۳

۳۔ راغب الاصفہانی، ابوالقاسم حسین، المفردات فی غریب القرآن، (ج۴) ص ۲۹۱

۴۔ طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین (ج۶) ص ۱۵۳

۵۔ ابن منظور، محمد بن مکرم (ج۳) ص ۱۱۷

کرامت انسان کے لیے خاص احترام قرار دیا گیا ہے[۱]۔ قرآن کریم میں تقریباً پچاس جگہوں پر یہ لفظ اور اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی پہلی آیتوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے بزرگ، بزرگوار، شریف، عزیز، نفیس، کثیر، بخشنے والا اور نیک وغیرہ کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔[۲]

لغت میں کرامت کے مقابلے میں آنے والا لفظ لئامت ہے۔ اس سے کرامت کے معنی میں بلندی و شرافت کا مفہوم اجاگر ہوتا ہے۔ کرامت کے معنی میں اتنی وسعت ہے جس میں بہت سے حسنات و خیرات کے وجوہ بھی شامل ہیں مثلاً خیر و خوبی کے مفاہیم جو خود خاص مفہوم کے حامل ہوتے ہیں حتیٰ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی بعثت کا ہدف مکارمِ اخلاق کو مکمل کرنا بتایا ہے۔[۳]

ب: **کرامت کے اصطلاحی معنی**: ملا صدرا کے نظریہ کے مطابق کرامت ایک ایسا خاص وجود ہے جس کا مکمل مصداق خدا کے لیے ثابت ہے۔ جو وجود کے بلندترین مقام کا حامل ہے بلکہ خود ہی وجودِ محض ہے۔ اس لحاظ سے چونکہ کرامت ایک وجودی امر ہے لہٰذا وجود بہت سے مرتبہ کا حامل ہوگا۔ اس لیے جس چیز کا وجود مکمل ہوگا اس کی کرامت بھی برتر ہوگی[۴]۔

انسان کی تکریم کا مقصد اس کی طرف ایسی شرافت و عنایت کو مخصوص کرنا یا نسبت دینا ہے جو دوسروں میں نہ ہو۔ تکریم ایک ایسا معنوی معنی ہے جس میں کسی دوسرے کا دخل نہیں ہے بلکہ صرف اسی شخص کی تکریم مد نظر ہوتی ہے جو شرافت و کرامت کا حامل ہو[۵]۔ کریم کے کچھ ایسے معنی بھی ہیں جس کا متبادل فارسی میں موجود نہیں ہے۔ بزرگوار روح اور ہر پستی سے منزہ و مبرہ ذات کو کریم کہتے ہیں۔ چونکہ کرامت کا معنی مشترکہ طور پر واجب الوجود پر اور ممکن الوجود دونوں پر اطلاق ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا

۱۔ معین، محمد، فرہنگ فارسی معین، ص ۳۵۰

۲۔ مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، ص ۲۷۱

۳۔ حسینی زبیدی، سید محمد، تاج العروس من جواہر القاموس (ج ۳) ص ۱۸۹

۴۔ ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، المبداء والمعاد (ج ۱) ص ۳۶

۵۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن (ج ۱۳) ص ۲۱۴

ہے کہ ماہیئت کے لحاظ سے کسی بھی زمرے میں داخل نہیں ہے[۱]۔

ملا صدرا کی نظر میں انسانی کرامت کے مبانی و اصول: ملا صدرا نے فلسفیانہ مبانی و اصول کے مطابق کرامت کو ثابت کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی اصل: کرامت اعتباری اور قراداد ی امر نہیں ہے بلکہ ایک حقیقی اور وجودی امر ہے۔ متعالی حکمت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو متن خارجی واقعیت کو پُر کردے وہی وجود ہے۔ اس حکمت کے ماتحت وجود کی اصلی اصالت مکمل طور پر واضح نظر آتی ہے اور ملا صدرا وجود کی اصالت کے قائل ہیں۔ سبزواری کا بھی عقیدہ ہے کہ "ان الوجود عندنا اصیل" وہ وجود کے اصیل ہونے کی علت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "لانہ منبع کل شرف"[۲] کیونکہ ہر موجود کا سرچشمہ وجود ہے اور جو چیزیں خدا کی طرف سے صادر ہوتی ہیں اس کا تعلق بھی وجود سے ہوتا ہے۔ لہٰذا الٰہی کرامت وجود کے لحاظ سے ایک ایسا حقیقی امر ہے کہ ذہن جس کا خلاصہ کرتا ہے۔ وہ قرارداد ی مفہوم نہیں ہے جو قرارداد کے لغو ہونے سے اپنا اعتبار بھی کھودے۔

دوسری اصل: متعالی حکمت میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وجود ایک واحد حقیقت ہے لیکن مرتبے والا ہے اور جب وجود مرتبے والا ہوا تو ہر وجودی وصف بھی صاحبِ مرتبہ ہوگا۔ اس لیے پہلی اصل کی بنیاد پر کرامت کو ایک وجودی امر تسلیم کیا، وہ امر مرتبے والا ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ ترجمہ: بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔[۳]

ملا صدرا کے وجود شناسی کے لحاظ سے نظامِ ہستی کی تمام موجودات میں پائے جانے والے کمالی اوصاف جتنے زیادہ ہوں گے اس کا وجودی مرتبہ بھی اتنا ہی برتر ہوگا یعنی وجودی مرتبہ جتنا بالاتر ہوگا اسی کی اتباع میں اس کے کمالی اوصاف بھی بہتر ہوں گے۔ اسی کے برعکس مثلاً نباتات کا وجودی مرتبہ جمادات سے

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، ادب فنای مقربان، ص ۲۴۹

۲۔ سبزواری، حاج ملا ہادی، منظومہ حکمت، ۱۰ اور ۱۱

۳۔ سورہ حجرات، آیت ۱۳

برتر ہے اور حیوان کا وجودی مرتبہ نباتات سے برتر ہے اور انسان حیوانات اور کائنات کی تمام مخلوقات حتی جنات سے بھی برتر ہے۔ ملائکہ مقربین اس عالم امکان کی سب سے برتر موجود ہیں یہاں تک کہ حق تعالیٰ تک بات پہنچتی ہے تو اس کا وجود سب سے برتر مرتبہ کا حامل ہے۔ حیات، علم، قدرت و ارادہ اس کے وجودی کمالات کا برترین حصہ ہیں اس لیے حق تعالیٰ لامتناہی اور لامتناہی سے بھی بالاتر وجود کا حامل ہے۔

اس لحاظ سے کرامت بھی صاحبِ مرتبہ امر ہے اور ہستی کے مختلف موجودات کا وصف بھی ہے جیساکہ عرب والے کسی قیمتی پتھر کے بارے میں کہتے ہیں: ''حجر کریم'' اور قرآن نے جنتیوں کی روزی کو ''کریم'' کہا ہے:

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔ ترجمہ: پھر جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہیں ان کے لئے مغفرت اور بہترین رزق ہے۔[1]

اسی طرح نباتات کو بھی کریم کہا گیا ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ۔ ترجمہ: کیا ان لوگوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کس طرح عمدہ عمدہ چیزیں اگائی ہیں۔[2]

اسی طرح خداوند عالم بھی جس حیوان کو غریزی الہام کرتا ہے وہ بھی کریم ہے جس طرح انسان کریم ہے۔ جو رسول انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ بھی کریم ہے:

وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ۔ ترجمہ: ان کے پاس ایک محترم پیغمبر آیا۔[3]

اور رسول اللہؐ بھی جو کتاب انسانوں کی ہدایت کے لیے لائے ہیں وہ بھی کریم ہے:

۱۔ سورہ حج، آیت ۵۰

۲۔ سورہ شعراء، آیت ۷

۳۔ سورہ دخان، آیت ۱۷

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۔ترجمہ: یہ بڑا محترم قرآن ہے۔[1]

فرشتے بھی کریم ہیں:

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۔ ترجمہ: کیا تمہارے پاس ابراہیم کے محترم مہمانوں کا ذکر پہنچا ہے۔[2]

اور خدا بھی کرامت کی صفت سے متصف ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ۔ترجمہ: میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے۔[3]

جن آیات میں یہ ذکر ہوا ہے کہ "کریم ہونا" حیوان، کتاب، انسان، ملک اور خداوند عالم (اپنے بلند وجودی مرتبہ میں) کا وصف ہے لیکن یہ بات بھی بدیہی ہے کہ خداوند عالم کی کرامت کا مرتبہ مخلوقات کی کرامت سے قابل مقایسہ نہیں ہے لہٰذا حیوان کرامت کے الگ مرتبہ کا حامل ہے اور انسان مرتبہ کے دوسرے مرتبہ کا حامل ہے اور خداوند عالم کرامت کے سب سے بلند مرتبہ کا حامل ہے۔ یہی بات کرامت کے صاحبِ مراتب ہونے کے معنی کو بیان کرتی ہے۔

تیسری اصل: صدرائی حکمت کے مطابق انسان نوع نہیں بلکہ انواع ہے[4]۔ یعنی انسان اپنی ابتدائی تعریف کے اعتبار سے ناطق ہے۔ انسان ولادت کے ابتدا میں ھیولانی عقل کا حامل ہوتا ہے یعنی نباتات و حیوان سے اس کا فرق صرف اس بارے میں ہے کہ انسان بولنے اور سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے، انسان کا یہی ناطق ہونا (بالقوہ) کرامت کا ایسا (بالقوہ) مرتبہ ہے جو ہر انسان کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر انسان اپنی فطرت کی بالقوہ عقل سے بہرہ مند ہو اور اس کو فعلی مرتبہ تک پہنچادے تو کرامت کی قوت اسے فعلی وجود کے درجات سے وابستہ کردے گی اور وہ تکامل کو پالے گا، ایمانی واخلاقی ملکہ بھی کسب کرلے گا، وہ

۱۔ سورہ واقعہ، آیت ۷۷

۲۔ سورہ ذاریات، آیت ۲۴

۳۔ سورہ نمل، آیت ۴۰

۴۔ ملا صدرا، الشواہد الربوبیہ، ص ۲۱۳ و ۲۲۳

الٰہی علم و معرفت کا مالک ہوگا اور خشیت الٰہی اس کے دل میں قرار پائے گی۔ اسی طرح کرامت کے بلند ترین مقام کی طرف گامزن ہوگا اور خدا کے نزدیک سب سے محترم انسان ہوگا لیکن یہ اکتسابی کرامت انسان کی ذاتی کرامت کے علاوہ کی چیز ہے۔

یہ کرامت عقل و ارادہ کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے انسان مراتب و درجات کو پاتا ہے اور ہر مرتبہ ایک خاص قسم کا ہوتا ہے۔ اس لیے جب انسانوں کو اس کی کرامت کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو اس میں بعض ایسے ہیں جو اپنے حیوانی مرتبہ سے ہی آگے نہیں بڑھے ہوں گے اور وہ ''تعالی و تکریم'' جیسے قابلیت و استعداد سے بہرہ مند نہیں ہوں گے لیکن بعض ایسے ہوں گے جو عقل کے بالقوہ اور بالفعل مرتبہ کو پاکر اس سے مستفید ہوتے ہوئے بلندی حاصل کر چکے ہوں گے اور روح کی طہارت اور ایمانی قوت کے ساتھ خود کو ملائکہ کی صف میں قرار دیا ہوگا جیسا کہ ملا صدرا لکھتے ہیں:

> " انسانی نفوس اپنے حادث ہونے کے آغاز میں صرف انسانی صورت ہی کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا اس اعتبار سے وہ انسان ہے۔ اس کے بعد جب وہ انسانی قوت اور ھیولانی عقل سے خارج ہو کر فعلیت کے مرحلہ میں پہنچ جائے تو ملائکہ، شیاطین، درندے اور چوپایوں کی مختلف شکلوں کے ساتھ دوسری صورت اختیار کرلیتا ہے[۱]۔"

اس لیے صرف انسان ہی اپنے دوسری صورت کے لحاظ سے مختلف شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ انسان کا باطن بھی ہر زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کرلیتا ہے یعنی انسان کا نفس ایک ثابت اور متجدد رخ ہوتا ہے۔ اس مطلب کو ہر کوئی اپنے وجدان کے ساتھ جانتا ہے کہ ایک طرف انسان کا ''میں'' اس کی پوری زندگی میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ثابت ہوتا ہے لیکن دوسری طرف اسے یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ چاہے جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہو یا روحانی و معنوی لحاظ سے ہو وہ ہر حال میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی وہ بلندی پاتا ہے اور کبھی تنزلی کی طرف جاتا ہے کیونکہ وہ مقامات و احوال کا حامل ہے۔ کبھی انسان ایک درندہ حیوان کی طرح غضبناک ہو جاتا ہے لیکن جب اس کے غضب کی آگ بجھ جاتی ہے تو وہ اپنے عمل پر شرمندہ ہوتا ہے اور تواب و رحیم خدا کی بارگاہ میں توبہ کرکے انسان کی راہ میں قدم رکھ دیتا ہے۔ کبھی یہی

۱۔ الشواہد الربوبیہ، ص ۲۲۳

انسان اپنے اعمال صالحہ میں استمرار کے اثر سے بلند معارف اور کامل ایمان کے حصول کے ساتھ ایسی بلندی اور ایسی کرامت وفضیلت کو پالیتا ہے کہ "خلیفۃ اللہ" قرار پاجاتا ہے اور نفس مطمئنہ کا مالک ہو جاتا ہے۔ پھر اس آیت کا مخاطب قرار پاتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۔ترجمہ: اے نفس مطمئن! تو اس حالت میں اپنے پروردگار کی طرف چل کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پس تُو میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔[1]

وہ ان دو اصل "جسمانیۃ الحدوث وحرکت جوھری" کے ساتھ معتقد ہیں کہ نفس وبدن کے درمیان فطری واتحادی ترکیب ہے۔ اسی لیے وہ انسان کو لامحدود موجود کے طور پر جانتے ہیں جس کا نہ تو وجود میں اور نہ ہی شناخت میں تعین ہوتا ہے اور انسان کو ایک واحد درجہ بندی کی حقیقت کے طور پر متعارف کراتا ہے جو اس کی ذات وجوہر میں مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے[2]۔ دوسری طرف، انسان اتنی طاقت رکھتا ہے کہ ہستی کے مراتب میں وہاں تک چلا جائے کہ مثالی و برزخی تجرد سے عبور کرلے اور فوق تجرد کے مقام تک سفر کرلے۔ یہ انسان کی اکتسابی کرامت وشان کی علامت ہے کیونکہ انسان ہمیشہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے ارتقائی مراحل کو ہمیشہ طے کرسکتا ہے[3]۔

انسان اگرچہ اپنی پیدایش کے آغاز میں ایک جیسا ہوتا ہے لیکن اپنے آگے کی وہ حرکت جو وہ اپنے اختیار وآزادی کے ساتھ گزارتا ہے، مختلف صورتیں اختیار کرلیتا ہے اور یہ انسان کے وجود کا تعجب خیز مقام ہے کہ ملاصدرا[4] اس مطلب کو اپنے لیے الہی الہامات جانتے ہیں[5]۔

۱۔ سورہ فجر، آیت ۲۷ تا ۳۰

۲۔ ملاصدرا، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ (ج۸) ص ۳۴۳

۳۔ ملاصدرا، مجموعہ رسائل فلسفی صدر المتالہین، ص ۳۶۱

۴۔ ملاصدرا کے وجود شناسی، خود ان کے وجود شناسی کا معلول تھی۔ کہک میں اس کی خلوت اپنی حقیقت کے مشاہدہ اور ہستی کی حقیقت کے مشاہدہ کی غرض سے تھی۔

۵۔ الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ (ج۹) ص ۱۹

ملاصدرا کی نظر میں انسانی کرامت کے اقسام اور اس کے لوازمات و ضروریات

ایک رخ سے کرامت کی دو قسمیں ہیں: ذاتی اور اکتسابی، جس کی مندرجہ ذیل شرح ہیں:

ا۔ ذاتی و تکوینی کرامت:

یہ ہے کہ وجودی اعتبار سے اور آدمی کی نوع کے اعتبار سے نظامِ آفرینش میں وہ بہت سی قوتوں سے مستفید ہوتا ہے اور اسی سے تعلق رکھتا ہے۔ ذاتی کرامت سے مراد یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس طرح سے خلق کیا ہے کہ دوسری موجودات کے مقابلہ میں وہ وجودی ساخت کے لحاظ سے بہت سے امکانات رکھتا ہے اور کلی طور پر وہ زیادہ اختیارات کا حامل ہوتا ہے اور تمام انسان اس کے حامل ہوتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی شخص کو ان تمام اختیارات کی صورت میں دوسری موجودات پر فخر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کو انسان کے لیے اہم معیار اور انسانی تکامل کا ذریعہ جاننا چاہیے۔ خداوند عالم سورہ تین کی آیت نمبر ۴ میں ارشاد فرماتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۔ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین ساخت و انداز کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ خدا نے انسان کو زندگی اور تعمیرات کے کردار سے زیادہ عظیم کردار ادا کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ایسی محترم و مکرم مخلوق کہ جس کے لیے خداوند عالم نے تمام جانداروں، پودوں اور فطرت کو مسخر کیا ہے اور وہ عقل و دانش کے نورانی سایے میں ایسا مقام پا جاتا ہے جو انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کردے[۲]۔

انسان کے ذاتی کرامت کے شواہد: ذاتی کرامت، انسان کی بالقوہ قوت اور استعداد کا ہی نتیجہ ہے جن میں سب سے اہم مندرجہ ذیل باتیں ہیں:

ا۔ رجبی، محمود، انسان شناسی، ص ۱۲۸

۲۔ ایضا، ص ۱۳۰

الف: **علمی ظرفیت**: ذاتی کرامت کا ایک سبب علم و معرفت ہے۔ جو عالم معاشرے میں علم کی قدر و منزلت کو جانتا ہے وہ مکرم و محترم ہے۔ ملا صدرا کی نگاہ میں انسان کی حقیقت علم ہے اور اس کی کرامت و شان کا میزان اس کی آگاہی اور فکر ہے کیونکہ اسلام میں حکمتِ اسلامی ہی تفکر کا بنیادی محور ہے۔ عقلمندی و دانائی کے مفاہیم کو ابن سینا اور فارابی جیسے مفکرین کی تالیفات میں مکمل طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے[۱]۔ تفسیر کی کتابوں میں دانائی اور تفکر ہی کو انسان کی تکریم کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے[۲]۔ لیکن ان کا یہ ماننا ہے کہ علم کا تعلق بھی وجود سے ہے لہٰذا جو احکام وجود پر جاری ہوں گے وہی علم کے لیے بھی جاری ہوں گے اور علم انسان کے لیے ایک قسم کی نورانیت ہے۔ جس صفت نے انسان کو تمام فرشتوں پر برتری دی ہے وہ علم و حکمت ہے[۳]۔

ملا صدرا کی حکمت کے مطابق علم اور عقل (مجرد علم، عقل ہی کو کہتے ہیں) دونوں وجودی امر ہیں لہٰذا انسان کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ وہ عقلی کائنات کو درک کرلے اور اپنے علمی و عقلی کمال میں سرگرم عقل[۴] سے مدد لے۔ یہی انسان کا امتیاز اور اس کی شان ہے کہ وہ تمام وجودی حقائق سے آگاہ ہوسکے کیونکہ وہ علم کو ایک مجرد امر تصور کرتے ہیں اور اس کے لیے معنوی شان کے قائل ہیں[۵]۔ وہ علمِ حقیقی کو مرتبہ والا جانتے ہیں اور ایک مرحلہ میں نظر کو عمل کا مقدمہ اور بلند مرتبہ میں عمل کو نظر کا مقدمہ جانتے ہیں لیکن وہ معتقد ہیں کہ عملی عقل، نظری عقل کی خادم ہوتی ہے تاہم تزکیۂ نفس کو دل پر معارفِ الٰہی کے اشراق کا مقدمہ جانتے ہیں[۶]۔ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علمِ حقیقی سے ملا صدرا کی مراد عقل ہی ہے۔

انھوں نے قرآنی آیات سے استناد کرتے ہوئے انسان کی تمام موجودات منجملہ فرشتوں پر برتری و

۱۔ دینانی، غلام حسین، جایگاہ ملا صدرا ر علوم عقلی، ص ۳۱

۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن (ج ۱۳) ص ۱۵۱

۳۔ الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ (ج ۳) ص ۲۹۲

۴۔ حکما نے سرگرم عقل کو عالمِ امر بھی جانتے ہیں اور اسلامی حکمت میں تربیت و رشد جہان کی مسئولیت اسی سرگرم عقل کے حوالے کی گئی ہے۔

۵۔ مجموعہ رسائل فلسفی صدر المتالہین، ص ۹۹

۶۔ الشواہد الربوبیہ، ص ۲۹۲

کرامت کو انسان کی تمام موجودات پر برتری تصور کیا ہے اور عمل کو برتری کا حصہ قرار نہیں دیا ہے۔ اسی لیے وہ انسان کی حقیقی حیات کو اس کی معقول حیات جانتے ہیں[۱]۔

ب: **خلافت الٰہی**: صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنی دلچسپ وجودی قابلیت کی وجہ سے خلافتِ الٰہی کے مقام کی راہ کو پاسکے کیونکہ انسانی کرامت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان روئے زمین پر خدا کا جانشین ہے۔ خلیفہ کے معنی میں غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف انسان ہی ایسی موجود ہے جو خداوند عالم کے کمالی صفات کا بہترین مظہر بن سکتا ہے اور اس عالمِ خلقت میں خیر و کرامت کا بہترین مظہر ہو سکتا ہے کیونکہ تمام شئون میں قائم مقام ہونا ایسا نمایندہ مقام ہے جو اس کی طرف سے خلافت کے منصب پر منتخب کیا جاچکا ہے لہٰذا اس مقام کے لیے انسان کا انتخاب ہونا، کمال کو پانے کے لیے لامتناہی قابلیت کو چاہتا ہے اور انسانی کمال اور اس کی معنویت اسی وقت معنی پیدا کرتی ہے جب تک وہ مسلسل ملکوتی والٰہی رابطہ برقرار نہ کرے۔

انسان کے جامع ہونے کی مختلف وجوہات ہیں، انسانی کرامت کے علاوہ اس کی ایک سب سے اہم وجہ خلافت ہے۔ ملا صدرا انسانی کرامت کو "خلیفۃ اللہ" کی تعبیر سے یاد کرتے ہیں اور معتقد ہیں کہ انسان کے لیے خلافت کا مستحق ہونا صرف اس کا تمام مخلوقات سے برتر ہونا ہی نہیں ہے بلکہ انسان کی وجودی جامعیت بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ در حقیقت ملا صدرا انسانی خلافت کو الٰہی کرامت کے نتائج و برکات شمار کرتے ہیں[۲]۔

ملا صدرا، ابن عربی سے متاثر ہو کر انسان کی خلقت کو حق جانتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کا ماننا ہے کہ مکمل مظہریت اور خلیفۂ الٰہی کے مقام کے اعتبار سے انسان، الٰہی صفات سے بہرہ مند ہے۔ ابن عربی آدمی کے بارے میں یہ نکتہ بیان کرتے ہیں: "ہر صفت کا ایک حق ہوتا ہے ہر وہ اسم جسے حق کہا جاسکے انسان کے اندر اس کی نظیر موجود ہوتی ہے"[۳]۔ اس کے باوجود ملا صدرا کا ماننا ہے کہ سب سے برتر قوت وہ ہے جس کے سبب انسان خلافت الٰہی کو اس کائنات میں پاتا ہے۔

عقل کی قوت وہ بلند ترین صفت ہے جو انسان کو تمام فرشتوں پر فضیلت عطا کرتی ہے اور وہ علم و

۱۔ ملا صدرا، تفسیر قرآن الکریم (ج۱) ص ۱۴۰

۲۔ ایضا، ص ۲۹۷

۳۔ ابن عربی، محی الدین، فصوص الحکم، ص ۵۵

حکمت ہے[1]۔انسان کی فطری کرامت، خدا سے اس کے خلافت کے مقام کے مرہون منت ہے۔چونکہ انسان خدائے کریم کا جانشین اور خلیفہ رہا ہے اس لیے کرامت کا حامل ہے اور خداوند عالم کی کرامت کا مظہر قرار پاتا ہے۔

ملا صدرا انسان کے خلافتی مقام کے بارے میں کہتے ہیں: خدا نے جانشینی کے امور کو انجام دینے کے لیے خود ہی معین کیا اور اپنے تمام اسما و صفات کو اسے دیدیا اور اس کو امور کی انجامدہی کے بارے میں سکھایا، پھر اپنی جانشینی کی مسند پر بیٹھایا اور اس خلیفہ کو انسان نام دیا تاکہ وہ ملک و ملکوت میں تصرف کرسکے[2]۔ اگر ایسی کرامت خلافتِ الٰہی کی طرف سے ہو تو وہ انسانی مقام کے لیے ہی ہوگی، انسان کے علاوہ اس سے کوئی بہرہ مند نہیں ہوسکتا کیونکہ ملا صدرا کی نگاہ میں انسان کی ذات و حقیقت، خدا کے تمام اسما و صفات کے لیے مکمل مظہر ہے، اسی لیے انسان حق کی تمام صفات کا جامع ہے (یعنی اس کے اندر تمام صفات موجود ہیں)، سبوح و قدوس جیسی تنزیہی صفات بھی اس کے اندر جمع ہیں اور خالق و رازق جیسی تشبیہی صفات بھی اس کے اندر موجود ہیں لیکن دوسری مخلوقات، اسمائے حق کی بعض صفات کا مظہر ہے مثلاً فرشتے جو خدا کی تقدیس بیان کرتے ہیں لیکن ان کے اندر خالقیت و رازقیت جیسی صفات موجود نہیں ہوتی[3]۔

ملا صدرا کی نظر میں ہر موجودات کی اپنی حد ہوتی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا۔ ہر موجود کچھ خاص مراتب کی حامل ہوتی ہیں جو اس کے لیے ہمیشہ ثابت ہوجایا کرتی ہے۔ جمادات، نباتات، حیوان، فرشتے اور شیطان اپنے اپنے مرتبہ میں ہمیشہ ثابت ہیں۔ صرف انسان ہی ایسا ہے جس نے جو کمالات حاصل کیے ہیں اس کے ٹھہراؤ کی حد نہیں ہے اور اس کے وجودی مراتب، خالص قوت اور فعلِ محض کے درمیان قرار پاتے ہیں۔ یہ انسان ہی ہے جو فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کے مقام کو پاسکتا ہے[4]۔ اسی وجہ سے انسان وجود کے درخت کا میوہ رہا ہے اور کائنات کے تمام وجود کو اسی کے لیے خلق کیا گیا ہے۔ ملا صدرا بیان کرتے ہیں کہ وجودِ عناصر سے مراد گیاہ کی خلقت ہے اور حیوان کی خلقت سے مراد، بشری اجساد کی خلقت ہے اور بشری

۱۔ ملا صدرا، اسرار الآیات، ص ۱۳۸

۲۔ ملا صدرا، رسالہ فی اتحاد العاقل والمعقول، (ج ۱۳) ص ۳۰۲

۳۔ ملا صدرا، تفسیر قرآن کریم (ج ۲) ص ۳۱۰

۴۔ نصری، عبداللہ، سیمای انسان کامل از دیدگاہ مکاتب، ص ۲۵۴

اجساد کی خلقت سے مراد، انسانی روحوں کی پیدایش ہے اور انسانی ارواح کی خلقت کا مقصد، روئے زمین پر خلیفۃ اللہ کی خلقت ہے البتہ جو کچھ خدا کے افعال و صفات و اسما کی نسبت انسان کی جامعیت و مظہریت کے بارے میں کہا گیا ہے وہ سب کا سب کامل انسان سے مربوط ہے اگرچہ انسان کی نوع کے لیے خداوند عالم کی خلافت و جانشینی کا امکان ہے۔

دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ تمام انسانوں کے اندر خداوند عالم کے تمام صفات و اسما کی مظہریت کی قوت و صلاحیت ہے لیکن بعض انسان ہی ان صلاحیتوں کو فعلیت (عملی جامہ) تک پہنچاتے ہیں۔ ہر انسان اپنی صلاحیت و استعداد کو جتنا فعلیت کے مقام تک پہنچاتا ہے وہ خلافت کے اتنے ہی درجے کو پاتا ہے۔

ج: **اختیار اور آزادی**: انسان کی ذاتی کرامت کا ایک دوسرا سبب استقلال اور ارادہ کی بحث و گفتگو ہے۔ انسان اپنے اختیار سے نیک کاموں کی انجامدہی کے ساتھ کمال کو پہنچ سکتا ہے حتی یہ چیز فرشتوں کے نصیب میں نہیں ہے۔ انسان کی خلقت ایسی ہے کہ اس کے وجودی استقلال کو انسانیت کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔ ملا صدرا کے فلسفیانہ نظام کے ماتحت چونکہ ہر مسئلہ وجود سے رابطہ برقرار کرنے کی صورت میں معنی پیدا کرتا ہے، اس لیے ارادہ، اختیار اور آزادی بھی ضرورت کے تحت وجودی تفسیر کا خواہاں ہوتا ہے۔

وحدت الوجود کی بنیاد کی بنا پر واجب الوجود سب سے بلند مقام پر قرار پاتا ہے۔ انسان بھی ایک ایسا موجود ہے جو صاحب اختیار ہے لیکن اس کی واقعیت و ہستی کے محتاج ہونے کا تعلق مبدا ہستی سے تعلق رکھنے کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ وجود کے معلول کا ربط وجود کی علت سے ہے اور معلول، علت کی شان میں سے ایک شان ہے جو ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ تک پہنچنے اور آگے بڑھنے کی ظرفیت و صلاحیت رکھتا ہے اور یہ تبدیلی بغیر اختیار و ارادہ کے محال ہے[1] لہٰذا ارادہ و اختیار جیسی صفاتی حقیقت واجب اور ممکن دونوں میں ایک تھی لیکن اس کے درجات اور مراتب ہر موجود کے وجودی مراتب کے تابع ہوتے ہیں[2]۔ یہ بھی انسانی کرامت کے اصولوں میں شمار ہوتا ہے۔

۱۔ المبداء والمعاد، ص ۲۹۹

۲۔ الحکمۃ المتعالیہ، ص ۳۳۵

ملا صدرا انسان کے ارادہ و اختیار کے عین وقت یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ اتصال و وابستگی میں ہی کمال ہے۔ کوئی موجود جتنا زیادہ وجود کے مرکز سے متصل ہوگا اتنا کامل تر ہوگا کیونکہ واجب الوجود ایسی حقیقت ہے جو وجود کی تمام جہتوں کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے۔ وہی شرافت و کرامت کا سرچشمہ اور سب سے برتر لذت ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ کمال، سکون و آسایش کی صفتیں بھی فراہم ہوتی ہیں [۱]، لہٰذا انسان کی کرامت و شان، ہستی کے سرچشمہ سے وابستہ ہونے میں ہے، چاہے ذاتی کرامت ہو، چاہے تکوینی و وجودی کرامت ہو، استقلالی نہیں ہے بلکہ انسان اختیار و ارادہ کے عین وقت ایسی موجود ہے جو مکمل طور پر وابستہ رہا اور اسی وابستگی میں ہی اس کی شان ہے۔

د: **الٰہی روح کا حامل ہونا**: انسان کی ذاتی کرامت کا ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کو مسجودِ ملائکہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کو مخلوق کی بہترین ترکیب میں قرار دیئے جانے کے بعد اس میں الٰہی روح پھونکی گئی:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۔ترجمہ: جب میں اسے تیار کرلوں اور اس میں اپنی خاص روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔[۲]

علامہ طباطبائی [۳]، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: انسان کا تسویہ (یعنی روح کا پھونکا جانا) اس کے اعضا کی تعدیل کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے بدن کے اعضا کو ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب و تکمیل کرے تاکہ وہ مکمل انسانی صورت میں بن کر آجائے اور اس کے اندر روح پھونکے جانے سے اس کو ایک زندہ مخلوق و موجود قرار دیا جائے۔ خدا نے انسان کے اندر روح کے پھونکے جانے کو اپنی ذات سے نسبت دی ہے اور ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی روح اس میں پھونکی ہے جس کا مطلب اس روح کو شرافت بخشا ہے اور ملائکہ کا سجدہ کرنا، انسان کے اندر روح الٰہی کے پھونکے جانے کا ہی نتیجہ ہے [۴] کیونکہ انسانیت کے مرحلہ سے

۱۔ الحکمۃ المتعالیہ، ص ۱۲۵

۲۔ سورہ ص، آیت ۷۲

۳۔ رجوع کریں: تفسیر المیزان، علامہ طباطبائی، ج۱، تفسیر مجمع البیان، علامہ طبرسی، ج۱، سورہ بقرہ کی ۳۱ تا ۳۳ آیات کے ذیل میں

۴۔ المیزان فی تفسیر القران (ج۱۷) ص ۳۴۲

قبل انسان کی صورت کے بارے میں جتنے بھی صنعی آثار ہیں وہ انسان اور دوسرے حیوانات کے درمیان مشترک ہیں یعنی انسانی خلقت کے مراحل میں جہاں نطفہ علقہ ہوتا ہے، پھر مضغہ اور اس کے بعد جنین ہو جاتا ہے یہ مراحل انسان و حیوان دونوں میں مشترک طور پر طے ہوتے ہیں لہٰذا اس لحاظ سے انسان اور دوسرے حیوانوں میں فرق نہیں ہے۔ اگر جنین نفس نباتی ہے تو تھوڑا تھوڑا کرکے حیوانی نفس کے مرحلہ کو پالیتا ہے۔ تحویل کے یہ مراحل انسان و حیوان دونوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ انسان کا تمام حیوانات سے جو امتیاز پایا جاتا ہے، وہ اس کے اندر الٰہی روح کے پائے جانے میں ہے[۱]۔ قرآن کریم کی جن آیات میں انسانی کرامت و جلالت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے وہ انسان کی روح اور اس کے الٰہی و ملکوتی پہلو کے بارے میں ہے مثلاً سورہ روم کی آیت ۳۰ اور سورہ اسراء کی آیت ۷۰ وغیرہ۔

۲۔ ملا صدرا کی نظر میں اکتسابی کرامت:

اکتسابی کرامت، انسان کی نفسانی صفات کے اعتبار سے اور اس کی تلاش و کوشش کے سبب اور اکتسابی تناسب کے لحاظ سے معنوی درجات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ہر شخص بلندترین درجہ تک پہنچ جاتا ہے وہ ''کریم تر'' اور ''محترم تر'' ہوتا ہے[۲]۔

اکتسابی کرامت اور نہایی کمال کا حصول اختیاری اعمال پر منحصر ہوتے ہیں البتہ ان اعمال کے ساتھ خدا پر ایمان ہونا اور پرہیزگار ہونا ضروری ہے[۳]۔ انسانی کرامت یعنی انسان کا کمالات کو پانا اور ایسی خصوصیات پر دسترسی حاصل کرنا جو انسان کے ارادہ و اختیار سے حاصل کی جائیں۔ تکوینی کرامت کے برعکس جو انسان کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں پر انسان کی تلاش و کوشش، بلندترین درجات کے حصول کے لیے ایک پل کا کام کرتی ہے۔

درحقیقت انسان کے اندر کمالات کو پانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن بعض افراد اس کو اپنے اختیار و ارادہ سے پالیتے ہیں اور بعض افراد اس کے مخالف کا راستہ اختیار کرتے ہیں جس کے سبب وہ اسفل

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، کرامت در قرآن، ص ۹۷

۲۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج ۹) ص ۱۷۸

۳۔ انسان شناسی، ص ۲۲۷

السافلین تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان و تقوا کی یہ تکریم ہے جو عمل کی تکلیف سے ہی وجود میں آتی ہے۔ چونکہ ہر انسان کی عقل متفاوت ہوتی ہے اس لیے اس کے اندر تکریم کے مراتب بھی یکسان نہیں ہوتے۔ قرآن کریم نے جس چیز پر توجہ کی ہے وہ مراتب کا تفاوت ہے جس کا سرچشمہ تقوا ہے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّـهِ أَتْقَاكُمْ۔

اکتسابی کرامت کے وقت انسان کے اندر پائے جانے والے تفاوت کے لیے خداوند متعال سے اس کی قربت کو میزان قرار دیا جاتا ہے جو اطاعت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور انسانوں کے درمیان اس کی توجہ کی شان کو میزان قرار دیتے ہوئے فاصلہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعض افراد بلندی پاتے ہیں اور اس طرح سے محترم قرار پاتے ہیں کہ "فکان قاب قوسین او ادنی" (سورہ نجم، آیت ۹) کے مصداق قرار پاتے ہیں اور خداوند عالم اس کو اجر کریم دیتا ہے۔ ان لوگوں کے مقابل میں جو کرامت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور خود کو "اولئک کالانعام بل ھم اضل"[1] کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اکتسابی کرامت کی کوئی حد نہیں ہے کیونکہ تقوا ہی کرامت کی بنیاد ہے جو محدود نہیں ہے[2]۔

ملا صدرا کی نگاہ میں اکتسابی کرامت کے شواہد

الف: **دانشمندی و حکمت**: ملا صدرا کی نگاہ میں حکمت و دانشمندی اکتسابی کرامت کی بنیادی ترین جڑ ہے جسے ان کے فلسفیانہ نظام میں تکوینی امر اور عقلی شان کے اعتبار سے نظری و عملی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے فلسفہ میں عقل ہی وجود کا سب سے برتر نشہ ہے[3]۔ وہ آیات و روایات کا سہارا لیتے ہوئے عقل کی عظمت کو بیان کرتے ہیں جہاں خداوند متعال فرماتا ہے:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّـهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۔ بے شک اللہ کے نزدیک سب جانوروں سے بدتر جانور وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو

۱۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹

۲۔ خمینی، روح اللہ، صحیفہ نور (ج ۱۰) ص ۲۹۱

۳۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج ۹) ص ۱۹۴

عقل سے ذرا کام نہیں لیتے۔[۱]

اسی طرح انہوں نے بہت سی روایات کا سہارا لیتے ہوئے عقلمندی کی فضیلت کو بیان کیا ہے جن میں پیغمبر اکرمؐ کی یہ حدیث ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا: ''اول ما خلق اللہ العقل'' [۲]۔اللہ نے سب سے پہلے عقل کو خلق کیا۔آیات و روایات سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ دین کی پیروی بھی عقل ہی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ عقلمندی و تعقل ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان دین کی اتباع کو سعادت بخش جانتا ہے[۳]۔

ملا صدرا کا یہ ماننا ہے کہ بہت کم ہی ایسے انسان ہیں جو اس نشہ کے ذریعہ بلندی کو پا سکتے ہیں اور انسان اپنی وجودی سیر کے اندر ایسی عقل کی ظرفیت رکھتا ہو کہ عقلی کائنات، عینی کائنات کے مشابہ ہو جائے اور عقل کا مرتبہ ایسا ہے جو ہستی کا سب سے بلند مقام ہے چونکہ انسان اپنی پیدایش کے وقت بالقوہ عاقل ہوتا ہے لہٰذا اس کی حقیقی انسانیت اس وقت ظہور کرتی ہے جب وہ عقلی انسان کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے اور عقلی کمال کو پا لیتی ہے۔یہی وہ مرتبہ ہے جہاں انسان ایک فعال و سرگرم عقل کے علم کے مرحلہ سے متصل ہو جاتا ہے اور عمل کے مرحلہ میں انسانِ کامل بن جاتا ہے[۴]۔

انسان کے وجود میں موجود شدت کی یہ علامت، بعد والے درجہ میں قوت سے فعل کی طرف ہیولائی عقل کی کارفرمائی ہے اور تیسرے درجہ میں کمالی صفات کے لیے اور کرامت کے لیے سرچشمہ قرار پاتی ہے کیونکہ وہ واحد حقیقت ہے جو وجود کے مختلف درجات کے مابین حرکت کر سکتی ہے اور روح کے کمالی اثر سے تجرد کے مقام تک پہنچ سکتی ہے اس لیے کہ انسان کے وجودی کمالات کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

ملا صدرا کی نگاہ میں انسانی کرامت اس وقت عینیت کو پا لیتی ہے جب وہ عرفا کے تحت تاثیر، انسانِ کبیر اور عالمِ صغیر کے فرضیہ کو قبول کرتا ہے[۵]۔اس کا ماننا ہے کہ کائنات ہی انسانِ کبیر ہے کیونکہ ایک انسانی پیکر کے جیسا ہے جو کلی نفس کا حامل ہے اور دوسری طرف سے دیکھا جائے تو انسان ہی صرف ایک ایسی عقلمند

۱۔ سورہ انفال، آیت ۲۲

۲۔ بحار الانوار (ج۱) ص ۹۷

۳ محمد رضایی، محمد، کلام جدید با رویکرد تطبیقی، ص ۶۳

۴۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج۹) ص ۵۳

۵۔ فصوص الحکم، ص ۴۹

مخلوق ہے جو کائنات کے حقائق کو سمجھ سکتا ہے اور اس کو معنی دار بنا سکتا ہے لہٰذا وہ عالمِ صغیر تھا اور کائنات میں اس کا ایسا مرکزی کردار ہے کہ بغیر اس کے یہ کائنات بے معنی ہو جائے گی کیونکہ انسان ایک ایسی موجود ہے جس کی غایت بھی ہے اور بلندی کی راہ میں بھی ہستی کی غایت رکھتا ہے۔ یہی چیز خود انسان کی کرامت و شان کو بیان کرتی ہیں[۱]۔

تعقل و خردمندی انسان کی ایسی خاصیت ہے جو انسان کی اکتسابی کرامت کی بنیاد شمار کی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں انسانی تکریم کی علت عقل جیسی نعمت ہے[۲]۔ ملا صدرا کی نظر میں عقلانیت انسان کی سب سے بنیادی خاصیت ہے۔ عقل سے مراد انسان کی وہ قوت مدرکہ ہے جو حکمت و دانائی کا سرچشمہ ہے اور وہ انسان کو وہاں تک لے جاتی ہے جہاں عقلی کائنات، عینی کائنات کے مشابہ ہو جاتی ہے[۳]۔ اس لیے انسان کی سب سے بہترین وہ صفت جو اس کو تمام فرشتوں پر برتری دیتی ہے، وہ عقلانیت ہے[۴] لہٰذا ان کی نگاہ میں عملی عقل کی تکامل کا مقدمہ نظری عقل کا تکامل ہے۔

صدر المتالہین نے عملی عقل کے لیے چار مراتب بیان کیے ہیں۔ انسان کا نفس انھیں مراتب کو طے کرنے کے بعد عمل کے مرحلے میں تکامل کو پالیتا ہے۔ وہ چار مراتب یہ ہیں: ظاہری تہذیب، علم اور ایمانی معارف کے ذریعہ دل کو نورانی کرنا، چوتھے مرتبہ میں نفس کو فنا کرنا اور خدا کی صفات و ذات میں غرق ہو جانا[۵]۔

انسانی مراتب کے تکامل کے بعد ملا صدرا نباتی نفس سے لے کر نفسِ ناطقہ تک کے سفر کے بارے لکھتے ہیں: اگر انسان نے اس مرتبہ کے بعد انسانی فضائل کے حصول کا آغاز کر لیا اور تلاش و کوشش سے عقلی معارف کو کسب کر لیا تو وہ بلندی پا کر ملائکۂ مقربین تک پہنچ جائے گا اور اس کا یہ مرتبہ اس کے انسان ہونے کے اعتبار سے ہی ہوگا۔

۱۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج۶) ص ۲۳۵
۲۔ المیزان فی تفسیر القران (ج۱۳) ص ۱۵۲
۳۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج۱) ص ۲۰
۴۔ ملا صدرا، تفسیر قرآن الکریم (ج۶) ص ۲۷۲
۵۔ شواہد الربوبیہ، ص ۲۰۷

ب: **انسان کی کمال طلبی**: ملا صدرا کی نگاہ میں انسان کی اکتسابی کرامت کی ایک دلیل انسان کی کمال طلبی ہے۔ کمال یعنی وہ چیز جس سے تمام شی مربوط ہو[۱]۔ انسان کی خاص قوت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کا اپنے عقلی امکانات کے کامل ہونے پر اعتقاد تھا اور انسان کا علمی و عملی کمال اس کی توجہ کا مرکز ہے[۲]۔

جو چیزیں انسانی شرافت و کرامت کو بیان کرتی ہیں اور بہت سے ایسے احکامات جو خداوند متعال کے بارے میں جاری ہیں وہ انسان کے بارے میں حفظ مراتب کے ساتھ بھی امکان پذیر ہیں۔ خدا جو کہ تمام اچھائیوں اور کمال کا سرچشمہ ہے، انسان بھی صلاحیت رکھتا ہے کہ اپنی ظرفیت کے اعتبار سے کمالی مراتب کو طے کرے اور ان صفات کے درجات سے آراستہ ہو جائے جو اس کی کرامت کو بھی بیان کرتا ہو اور اس کی زندگی کو معنی دار اور با ہدف بھی بناتا ہو۔ عمر کی تجلی الہی سرمایہ سے بہرہ مند ہونے کا نتیجہ ہے، وجودی قابلیت پر توجہ انسان کے تکامل و ارتقا میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے لیکن انسان اس سے غافل ہے[۳]۔ ملا صدرا نے انسان کی قوت و عظمت کو قبول کرنے کے ساتھ اس کی بلندی و کمال کی جہت میں اس کی استعداد و ظرفیت کی پرورش پر توجہ کی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی کمال طلبی کا مسئلہ ایک وجودی امر ہے جو انسان کے چار معنوی[۴] سفر پر منظّم ہے۔

ان چاروں سفر میں انسان کے متعدد مراحل اور اس کے تکاملی سیر پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ البتہ ملا صدرا نے انسانی تکامل کے لیے دو شرطیں قرار دی ہیں: ''ایک خدائی رنگ[۵] کو اپنانا ہے اور دوسری شرط ظرفیت و استعداد کا ہونا'' اور کمال کو انسان کے اندرونی و حقیقی تکامل کا ذریعہ جانتے ہیں اور اس کمال کا معیار یہ ہے کہ انسان نفس قدسی کے بلندترین مراتب کو پالے[۶] اگرچہ ملا صدرا حکمت نظری کو اہمیت کے اعتبار

۱۔ الکمال ہو الاتصال بالمعقولات و مجاورت الباری و تجرد عن المادیات۔

۲۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج۱) ص ۱۲

۳۔ ملا صدرا، رسالہ سہ اصل، ص ۱۵

۴۔ کتاب اسفار اربعہ کی نو جلدوں میں سے دو جلدیں انسان کی تکاملی سیر سے مخصوص ہیں۔

۵۔ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۔ ترجمہ: ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کیا ہے اور اللہ کے رنگ (دین اسلام) سے بہتر کس کا رنگ ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۳۸)

۶۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج۳) ص ۳۳۵

سے حکمت عملی سے بلند تر جانتے ہیں[1] لیکن مراتب میں اور کمال کے بلند تر درجات میں عمل کو نظر کا مقدمہ قرار دیتے ہیں اور ان کا یہ ماننا ہے کہ عمل ہی راہ ہموار کرتا ہے تاکہ انسان کا ملکوتی چہرہ نمایاں ہوسکے اور ہر اندرونی و بیرونی رکاوٹیں برطرف ہو جائیں۔ لہٰذا اگر عدم یا وجود کے امور کی وجہ سے کوئی حجاب مانع نہ ہو (جس کی بیشتر مشغولیت غیر حق ہوتی ہے) تو ملک اور ملکوت کی اصلی صورت انسان کے لیے متجلی ہوگی اور یہ خود انسانی کرامت کی ایک علامت ہے[2]۔

ملا صدرا جوہری حرکت کو انسان کی کمال طلبی کی علت و بنیاد جانتے ہیں اور ان کا یہ ماننا ہے کہ انسان دائمی تکامل کی سیر میں نقص سے کمال تک پہنچ جاتا ہے اور اس کی یہی تبدیلی انسان کی اکتسابی کرامت کی شان ہے جو اس کی انسانیت کے ظہور کا سبب بنتی ہے[3]۔ جبکہ ہر مرحلہ میں اس کی شخصیت ایک ہی ہے[4]۔

ج: **سعادت طلبی**: انسان کی سعادت و نیک بختی اس کے کمال میں ہوتی ہے۔ سعادت یعنی موجودہ واقعیت سے انسان کے اندر خوشنودی و رضایت کا پایا جانا۔ ملا صدرا کے نزدیک انسان کی اکتسابی کرامت کا ایک شاہد انسان کی سعادت طلبی ہے۔ ملا صدرا کا یہ اعتقاد ہے کہ سعادت ایک وجودی امر ہے، انسان کی بلندی کی سیر، وجود کے مراتب میں جتنی مکمل ہوگی وہ اتنا زیادہ سعادت مند اور نیک بخت ہوگا[5]۔

ملا صدرا کی فلسفیانہ نگاہ میں غور و فکر کرنا سعادت کا رکن شمار ہوتا ہے کیونکہ انسان کی انسانیت کا دار و مدار اس کی سوچ کے مطابق ہوتا ہے۔ ملا صدرا کی نظر میں انسان کا گوہر اس کی عاقلہ قوت ہے اور حقیقی سعادت و کمال، عقل کی سعادت ہے۔ لہٰذا انسان کی عقلی معرفت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ واقعی سعادت سے بہرہ مند ہوگا۔ اس لیے عقلِ قدسی سے اتحاد، انسانیت کا بلند ترین مقام اور سعادت کا سب سے برتر درجہ ہے جس پر دسترسی کا امکان، اکتسابی کرامت کے سایے میں ہی ہوسکتا ہے چونکہ حقیقی حیات،

۱۔ حکمت عملی و نظری، ص ۳۶

۲۔ الشواہد الربوبیہ، ص ۳۳۸

۳۔ ملا صدرا تفسیر القرآن الکریم کے جلد ۸ صفحہ ۵۵ پر اس بارے میں لکھتے ہیں: ''ثم ان کل موجود من الموجودات الکائنۃ فی ھذا العالم لہ طور واحد من الاطوار لایتعداہ الا الھویۃ الانسانیۃ فان لھا قابلیۃ الارتقاء من اسفل الاسافل الی اعلی الاعلی''۔

۴۔ ملا صدرا، تفسیر قرآن کریم (ج ۵) ص ۳۷۴

۵۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج ۹) ص ۱۲۱

حیاتِ معقول ہے لہٰذا حقیقی سعادت بھی معقول سعادت ہوگی اور اندھی تقلید سعادت سے محرومیت کا سبب اور تنزلی کا سرچشمہ قرار پائے گی[۱]۔ لیکن ملاصدرا کی عرفانی نگاہ میں تشکیکِ وجود کے نظریہ کو مد نظر رکھتے ہوئے سعادت کے بھی درجات ہیں کیونکہ انسان کوئی معلوم مقام نہیں رکھتا اس لیے اس کے کمال و بلندی کی کوئی حد نہیں ہوتی لہٰذا سعادت کا سب سے برتر مرتبہ قربِ خداوندی ہے۔

ملاصدرا بیان کرتے ہیں کہ قربِ خداوندی میں ناقابل توصیف سرور انبساط پوشیدہ ہے اور وہ انسان کے اندر اسمائے الٰہی کا پایا جانا ہے[۲]۔ یہ تمام چیزیں خدا کے نزدیک انسان کی کرامت و منزلت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اکتسابی کرامت کے تکامل وارتقاء میں موثر اسباب

اکتسابی کرامت کے ارتقا میں متعدد اسباب کا دخل ہوتا ہے۔ اکتسابی کرامت کا نتیجہ ایمان و تقوا، علم و عمل صالح وغیرہ جیسے فضائل ہوتے ہیں کہ انسان تلاش و کوشش سے اپنی شان و منزلت کو بلندی عطا کرتا ہے اور انسانی کمالات کی بلندیوں کو پا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض کے بارے میں بیان کریں گے۔

الف) **تقوا**: تقوا اکتسابی کرامت کے اسباب و لوازمات میں سے ایک ہے اور کرامت و تقوا کے درمیان ایک بلاواسطہ رابطہ پایا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہوتا ہے:

> إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ ترجمہ: تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے محترم وہی ہے جو تقوا کے لحاظ سے برتر ہو۔[۳]

متقی افراد بھی تقوا کی کرامت کے وسیلے سے کچھ حقوق اور ذمہ داری کے مالک ہوتے ہیں جو مومنین کے فرائض اور حقوق کے مطابق ہیں۔ تقوا "وقی" سے نکلا ہے جس کا معنی محفوظ رہنا ہے۔ گناہ سے دوری

۱۔ المبدا والمعاد، ص ۶۱۸

۲۔ الحکمۃ المتعالیہ (ج ۸) ص ۲۵۵

۳۔ سورہ حجرات، آیت ۱۳

اختیار کرنے کو تقوا کہتے ہیں، اس وجہ سے تقوا اختیار کرنے والا اخروی شقاوت سے محفوظ ہوتا ہے[۱]۔ اس لیے گناہ سے نفس کے محفوظ رہنے کے ملکہ کو تقوا کہا گیا ہے[۲]۔ تقوا انسانی کرامت کا معیار ہے لہٰذا جس کا تقوا جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ الٰہی کرامت سے بہرہ مند ہوگا۔

ملا صدرا معتقد ہیں کہ تمام ملکوتی صفات کا سرچشمہ نورِ علم اور معرفت ہے اور جہل و نادانی تمام شیطانی صفات کا سرچشمہ ہے۔ جس دل میں معرفت کا نور روشن ہوگا وہ عقل کو دل سے تمام کدورتوں کو ختم کرنے پر مجبور کرے گا اور اس کو تقویٰ کے راستے اور ریاضت کے ذریعہ اخلاقی آلودگیوں اور خباثت سے پاک و صاف کرے گا، اس وقت ملکوتی خزانوں اور غیب الٰہی سے نیکیوں کی روشنی اس پر پڑنے لگتی ہے[۳]۔ وہ رحمت و بخششِ الٰہی تک پہنچنے کا راستہ امور کے حقائق سے علم و آگاہی رکھنے کو جانتے ہیں البتہ اس شرط کے ساتھ کہ دنیا سے دل لگی تقوا کے ذریعہ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی نگاہ میں تقوا ہی کے ذریعہ نجات حاصل ہوتی ہے اور علم کے ذریعہ خداوند عالم کی قربت دستیاب ہوتی ہے[۴]۔

ب) **ایمان**: ایمان ایسی چیز ہے جو مومن کے لیے ذمہ داریاں لاتی ہے □ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کا خطاب اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ایمان انسانی فضائل کی ایک اہم ترین فضیلت ہے اور انسانی کرامت کا ایک اہم سبب بھی شمار ہوتا ہے۔

ملا صدرا کی نظر میں ایمان کی حقیقت ایک فطری امر ہے جو اکتسابی درجات کا حامل ہے[۵] کیونکہ انسان اپنی پیدائش کے وقت ہر طرح کے علم و آگاہی سے خالی ہوتا ہے لیکن خداوند عالم نے انسان کے اندر بلند ہونے کی ظرفیت الہام کر دی ہے لہٰذا آہستہ آہستہ مومن ربانی حقائق اور الٰہی علوم سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے اس لیے ایمان شدت و ضعف کو بھی قبول کرتا ہے اور کمال و نقص کو بھی قبول کرتا ہے یعنی اکتساب کے ابتدائی مراحل میں ضعف و ناقص ہوتا ہے لہٰذا انسان کا وجود نیک اعمال کی انجامدہی اور پاکیزہ سوچ سے رفتہ

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، ہزار و یک نکتہ (ج ۲) ص ۲۹۰)
۲۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن، ص ۴۵۹
۳۔ ملا صدرا، مفاتیح الغیب، ص ۱۸۰
۴۔ ملا صدرا، تفسیر قرآن کریم (ج ۷) ص ۳۷۵
۵۔ ملا صدرا، اسرار الآیات (ج ۱) ص ۸۸

رفتہ مستحکم ہو جاتا ہے اور درجات کے کمالی مراتب کی طرف گامزن ہو جاتا ہے اور وہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کا علم ''عین'' ہو جاتا ہے اور ایمان ''عیان'' اور معرفت و شناخت ''مشاہدہ'' میں بدل جاتی ہے۔ یہیں پر کہا جاتا ہے کہ معرفت و شناخت بیج ہے اور مشاہدہ اس کا دانہ ہے[۱]۔

ملا صدرا حقیقی ایمان کو تمام سعادت، فضیلت اور بہت سی نیکیوں کا سرچشمہ جانتے ہیں جس کے توسط سے انسان خدا کے تقرب اور کرامت کو دستیاب کرتا ہے۔ وہ اسرار الآیات میں لکھتے ہیں:

> ''سعادت اور حقیقی نیک بختی اور خدا سے قربت کی بنیاد حکمتِ الٰہی سے ہے جس کی تعبیر یہ ہے کہ خداوند متعال، فرشتوں اور آسمانی کتابوں، رسولوں اور قیامت کے دن پر ایمان رکھا جائے''[۲]۔

اسی طرح ملا صدرا ایمان کو ایسا نور جانتے ہیں کہ نفس جس کی روشنی میں طاقت و نقص سے نکل کر فعلیت اور کمال کی منزل کو پالیتا ہے اور عالمِ اجسام و تاریکی سے نجات پا کر عالمِ ارواح و انوار تک پہنچ جاتا ہے اور حق تعالیٰ کے دیدار اور اس سے ملاقات کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

ج) **عمل صالح**: نجات پانے اور سعادت پانے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اعتقادی لحاظ سے موحد ہو اور اپنی جان کو خدا کے حوالے کرے یعنی خدا کے آگے سر تسلیم خم کرے، سراپا اس کا مطیع ہو جائے اور عمل صالح بھی انجام دیتا رہے لہٰذا صرف دل سے موحد ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اگر کوئی ایسی کرامت کو پانا چاہتا ہے تو اس کے لیے صرف عمل صالح کا ہونا کافی نہیں ہے کیونکہ عمل صالح انسان کو کرامت کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

ملا صدرا کی نگاہ میں تمام عبادت و ریاضت حکمت کی آمادگی کے لیے ہیں اور معرفت کا مقدمہ ہیں۔ اور اندرونی حالت اور باطن کو پاک کرنے اور دل کو زنگ و آلودگیوں کی جمی ہوئی گردوں سے جلا بخشنے کے لیے ہیں تاکہ دل تابناک و منور ہو جائے اور وجہ اللہ کا سامنا کرنے کے لائق ہو سکے[۳]۔ جب انسان تمام

۱۔ ملا صدرا، شرح اصول کافی (ج ۳) ص ۱۴۳

۲۔ الشواہد الربوبیہ، ص ۱۱۷

۳۔ ملا صدرا، تفسیر قرآن کریم (ج ۴) ص ۴۲۳

تعلقات اور اس کا دل تمام کدورت و آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں وہ اللہ کا خالص بندہ ہو جاتا ہے[۱]۔

ملا صدرا انسان کے عبادی اعمال کی ضرورت کی دلیل کے بارے میں کہتے ہیں:

"انسان کا عبادی عمل اور قلبی و بدنی عبادت کا ضرورت مند ہونا انسان کے نفس کی پاکیزگی کے لیے ہے تاکہ شرعی احکامات کی انجامدہی بدن کو سرگرم نہ کرے اور اس کی خواہشات و شہوت کے ساتھ اس کا شوق اپنی تمام ضرورت کے نتیجے میں بدن سے منفعالانہ صورت ظاہر نہ کرے اور اس کی ہوا و ہوس ظاہر نہ ہو جائے اور نہ ہی فرمانبرداری و تسلیم کے بجائے بدنی آرزوئیں اثر انداز ہو جائیں کیونکہ نفس کی مخصوص لذتیں سبب بنتی ہیں کہ انسان اللہ کا تقرب حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے اور خوبصورت امور اور انوار قدسی کے مشاہدہ سے محروم ہو جاتا ہے"[۲]۔

ملا صدرا کے اعتقاد کے مطابق اخلاص تمام عمل کی شرط ہے اور اس کے بغیر عمل و عبادت بغیر روح کے جسم کی مانند بے حاصل ہوگا۔ وہ جسمانی اعمال کی فضیلت و اہمیت کو دلی نیتوں اور یقینی اعتقادات کے مرہون منت جانتے ہیں[۳]۔

د) **جہاد و شہادت**: اسلام میں جہاد بہت عظیم فضیلت کا حامل ہے۔ خدا کے نزدیک مجاہدین کی بہت عزت و احترام ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہوتا ہے:

فَضَّلَ اللَّـهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۔

ترجمہ: اللہ نے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو درجہ کے اعتبار سے بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت دی ہے۔[۴]

۱۔ ایضا، ص ۴۹

۲۔ ایضا، ۱۹۸۱، ج ۱: ۳

۳۔ عبد اللہی، ۱۳۹۰: ۳۳۸

۴۔ سورہ نساء، آیت ۹۵

مجاہد جب شہادت کے مقام کو پاتا ہے تو وہ عند اللہی مقام کو پالیتا ہے جیسا کہ خداوند متعال فرماتا ہے؛ ''شہدا ایسی زندہ مخلوق ہیں جو خدا کے پاس سے روزی پاتے ہیں''۔

اسی کرامت کے وسیلہ سے مجاہدین بھی خدا اور لوگوں کے نزدیک مسئولیت اور لوگوں پر حقوق رکھتے ہیں۔ ہم نے جتنی چیزیں یہاں پر شمار کی ہیں یہ سب اکتسابی کرامت کے اسباب ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی مسئولیت اور دوسری طرف اس کے لیے ایک حقوق کو ثابت کرتے ہیں۔

نتیجہ

اسلام میں انسان غیب و شہود کا جامع ترین اور واجب الوجود کا کامل ترین مظہر ہے جو لوح محفوظ ہونے کی لیاقت رکھتا ہے اور وہ خداوند عالم کے تمام صفات کا جلوہ بن سکتا ہے۔

ملا صدرا فقرِ وجودی کی بنیاد اور عاقل و معقول کے اتحاد کو مد نظر رکھتے ہوئے نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان کی کرامت و عظمت اتصال و وابستگی میں ہے۔ ہر موجود جتنا اپنے مرکزِ وجود متصل ہوگا اتنا مکمل ہوگا کیونکہ صرف اس کا وجود مستقل ہے اور تمام موجودات مبدإ ہستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ انسان ذاتی کرامت کا حامل ہے لیکن عقل قدسی اور مبدإ ہستی سے رابطے کی صورت میں اکتسابی کرامت کو پاتا ہے اور یہ خردمندی و دانائی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔

ملا صدرا کی نگاہ میں انسان خداوند عالم کا جانشین ہے اور اس کا وجود بے انتہا ظرفیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اپنی آنے والی پستی اور بلندی کی راہ کو انتخاب کرتا ہے۔ وہ ایسی خاص جامعیت کا حامل ہے کہ خداوند عالم کی تکریم کا حامل ہو جاتا ہے اور اس آیت ''ولقد کرمنا بنی آدم۔۔'' کو اس نے اپنا افتخار قرار دیا ہے۔

حکمتِ عالیہ میں انسان ذاتی اور اکتسابی کرامت کا حامل ہوتا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ذمہ داری اور اپنے حقوق ہیں۔ انسان کی کرامت ایک وجودی حقیقت ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور یہ ایک درجہ بند اور تشکیکی امر ہے۔ ہر موجود اپنے وجودی مرتبہ کے لحاظ سے کریم ہے جس کا سلسلہ خدائے کریم تک پہنچتا ہے۔ ذاتی اور اکتسابی کرامت انسان کی کرامت کے دو مرتبے ہیں جو ہر فرد کے لیے متصور ہیں لیکن پہلا الہی فطرت کے فیض سے اور دوسرا اس کے تفضل سے ہیں جو انسان کی تلاش سے حاصل ہو جاتے ہیں۔

منابع و مآخذ

قرآن کریم

- ابن عربی، محی الدین، فصوص الحکم، انتشارات الزہرا، تہران، ۱۳۷۰
- ابن فارس، ابی الحسین احمد، معجم المقاییس اللغۃ، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۸
- ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، دار الاحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۲
- افلاطون، دورہ کامل آثار افلاطون، ترجمہ محمد حسن لطفی، انتشارات خوارزمی، تہران، ۱۳۸۰
- بایرتر، کورت، ایدہ کرامت انسان، ترجمہ شہین اعوانی، ۱۳۸۴
- جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر انسان بہ انسان، تحقیق محمد حسین الہی زادہ، انتشارات اسراء، قم، ۱۳۸۶
- جوادی آملی، عبداللہ، رحیق مختوم (شرح حکمت متعالیہ)، مرکز نشر اسراء، قم، ۱۳۷۵
- جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن، انتشارات اسراء، قم، ۱۳۸۳
- جوادی آملی، عبداللہ، کرامت در قرآن، مرکز نشر فرہنگی رجاء، قم، ۱۳۶۹
- جوادی آملی، عبداللہ، ادب فنای مقربان، : انتشارات اسراء، قم، ۱۳۸۵
- جوادی آملی، عبداللہ، کرامت در قرآن، مرکز نشر فرہنگی رجاء، تہران، ۱۳۷۶
- جوادی آملی، عبداللہ، ہزار و یک کلمہ، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۱
- حسینی زبیدی، السید محمد، تاج العروس من جواہر القاموس، انتشارات دار احیاء التراث، بیروت، ۱۴۰۷
- خمینی، روح اللہ، صحیفہ نور، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۸۷
- دینانی، غلام حسین، جایگاہ ملا صدرا در علوم عقلی، مجموعہ مقالات دومین ہمایش جہانی ملا صدرا، بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۳
- دینانی، غلام حسین، حکمت نظری و عملی، مجموعہ مقالات نخستین ہمایش ملا صدرا، بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۷
- راغب اصفہانی، ابو القاسم الحسین، المفردات فی غریب القرآن، دفتر نشر کتاب، تہران ۱۴۰۴
- رجبی، محمود، انسان شناسی، انتشارات موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی، ۱۳۷۹

- سبزواری، حاج ملا ہادی، منظومہ حکمت، ، دارالعلم، قم
- طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۴۱۷
- طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ترجمہ سید محمد باقر موسوی ہمدانی، انتشارات حوزہ، قم، ۱۳۷۴
- طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، الوفاء، بیروت، ۱۴۰۳
- عبد اللہی، مہدی، کمال نہایی انسان و راہ تحصیل آن از دیدگاہ فیلسوفان اسلامی، موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ، قم، ۱۳۹۰
- فراست، اسماعیل، درس ہای اساسی فلاسفہ بزرگ، ترجمہ منوچہر شادان، انتشارات بہجت، تہران، ۱۳۸۵
- محمد پور دہکردی، سیما، کرامت انسان از دیدگاہ ملا صدرا و کانت، موسسہ بوستان کتاب، قم، ۱۳۹۱
- محمد رضایی، محمد، کلام جدید با رویکرد تطبیقی، دفتر نشر معارف، ۱۳۹۰
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۸۸
- مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، تہران
- معین، محمد، فرہنگ فارسی معین، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۵
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، المبداء والمعاد، تصحیح سید جلال الدین آشتیانی، دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۸۰
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ، قم: انتشارات مصطفوی، قم، ۱۳۶۸
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، مجموعہ رسائل فلسفی صدر المتالہین، تصحیح حامد ناجی، حکمت صدرا، تہران، ۱۳۷۵
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، اسرار الایات، تصحیح محمد موسوی، انتشارات حکمت، تہران، ۱۳۸۵
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، تفسیر القرآن الکریم، تحقیق محمد جعفر شمس الدین، انتشارات دار التعارف بیروت، ۱۴۱۹
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، رسالہ سہ اصل، تصحیح سید حسین نصر، بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۱

- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، الشواہد الربوبیہ، تصحیح سید جلال الدین آشتیانی، انتشارات بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۲
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، رسالہ فی اتحاد العاقل والمعقول، تصحیح بیوک علیزادہ، حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۷
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، مفاتیح الغیب، ترجمہ و تعلیق محمد خواجوی، انتشارات مولا، تہران، ۱۳۶۳
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، الاسفار الاربعۃ، تصحیح و تحقیق، علی اکبر رشاد، با اشراف سید محمد خامنہ ای، بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۲
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، اسرار الآیات، مقدمہ و تصحیح محمد خواجوی، انتشارات انجمن حکمت و فلسفہ ایران، تہران، ۱۳۴۰
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، التفسیر القرآن الکریم، تحقیق محمد خواجوی، انتشارات بیدار، قم، ۱۳۶۶
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، الشواہد الربوبیہ، تصحیح و تحقیق سید جلال الدین آشتیانی، المرکز الجامعی للنشر، ۱۳۶۰
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، رسالہ سہ اصل، تصحیح دکتر سید حسین نصر، دانشگاہ معقول و منقول، تہران، ۱۳۴۰
- ملا صدرا، محمد بن ابراہیم، شرح اصول کافی، مصحح محمد خواجوی، موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی، تہران، ۱۳۸۳
- نصری، عبداللہ، سیمای انسان کامل از دیدگاہ مکاتب، انتشارات دانشگاہ علامہ طباطبائی، تہران، ۱۳۷۶
- یگر، ورنر، پایدیا، ترجمہ محمد حسین لطفی، انتشارات خوارزمی، تہران، ۱۳۷۶

حضرت نظام الدین اولیا کی فقہی بصیرت

(فوائد الفواد کے خصوصی حوالے سے)

مؤلف: ڈاکٹر محمد اسامہ

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ (۱۲۳۸-۱۳۲۵ء) ہندوستان کی روحانی، تہذیبی اور اسلامی تاریخ میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ اس سرزمین میں چشتیہ سلسلے کے چوتھے بڑے بزرگ اور اسی سلسلہ کی ایک شاخ "چشتیہ نظامیہ" کے بانی بھی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ملک و بیرون ملک کو اپنی روحانی، علمی اور اصلاحی خدمات سے متاثر کیا بلکہ وہ تاقیامت آنے والی نسلوں کے لئے رہبر اور رہنما ہیں۔ ان کا شمار ان اولیائے عظام میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی، اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے تبلیغ و ارشاد کے ساتھ ساتھ دین اسلام کی خدمت کے لئے ایک عظیم تحریری سرمایہ بھی چھوڑا ہے۔

زیر نظر مقالے میں اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی، لیکن اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیات اور علمی خدمات کا بھی مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔

مختصر سوانح حیات

سلطان المشائخ کی ولادت یوپی کے مشہور شہر بدائیوں میں ۶۳۶ھ/۱۲۳۸ء میں ہوئی۔ ان کا نام محمد اور القاب نظام الدین والملۃ، نظام الاولیاء، محبوب الٰہی، امام الصدیقین، امام المحبوبین ہیں[۱] البتہ وہ اول الذکر لقب یعنی نظام الدین سے زیادہ مشہور و معروف ہوئے۔ ان کے والد محترم حضرت خواجہ سید احمد اور والدہ

۱۔ القادری، محمد حبیب، سیرت خواجہ نظام الدین اولیاء المعروف محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۹

محترمہ کا نام حضرت بی بی زلیخا تھا۔ دونوں کا شمار اپنے وقت کے مشہور اولیاء اور صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا سلسلہ نسب کچھ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔[1]

ان کی تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ محترمہ کا بڑا ہاتھ رہا۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر شیوخ میں حضرت علاء الدین اصولی، حضرت مولانا شمس الدین خوارزمی، شیخ محمد بن احمد الماریکلی (کمال الدین زاہد)، بابا گنج شکر، ابو شکور سالمی، برہان الدین محمود بن ابی الخیر اسعد بخاری، امین الدین محدث تبریزی اور علامہ برہان الدین المرغینانی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بدایوں میں انہوں نے زیادہ تر ادب، لغت، فقہ اور مقامات حریری کا درس لیا اور پھر مزید تعلیم کے لئے ۱۶ سال کی عمر میں دہلی تشریف لے آئے۔ دوران قیام وہ ۶۶۷ھ/۱۲۶۹ء میں حضرت بابا گنج شکر سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے اَجودھن کا رخ کرتے ہیں اور یہیں سے ان کا عروج شروع ہوتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے تعلقات دہلی کے سلاطین اور امراء سے بھی رہے۔ فوائد الفواد کے مطابق سلطان المشائخ کی ولادت سے وفات تک، دہلی کے تخت پر کل چودہ (۱۴) بادشاہ بیٹھے اور ان کے دہلی تشریف لانے کے بعد گیارہ (۱۱) بادشاہ تخت نشین ہوئے جن میں سے کم از کم تین ان کے معتقد بھی رہے، لیکن حضرت کی درویشانہ طبیعت نے نہ تو کبھی وظیفہ اور منصب لیا اور نہ ہی کبھی اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھایا البتہ وہ برابر بادشاہوں اور امراء کی اصلاح کرتے رہے۔

نیز انہوں نے دعوتِ اسلام کی طرف خصوصی توجہ دی جس کی وجہ سے نہ صرف غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد ان کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئی، بلکہ کثیر تعداد میں مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور نیک و صالح بن کر اپنی باقی زندگی گزاری۔ یقیناً اس میں ان کے مربی اور رہنما حضرت بابا گنج شکر کی تربیت اور ان سے بیعت کا بھی اثر رہا ہوگا۔ حضرت محبوب الٰہی کی وفات ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں دہلی میں ہوئی اور انہیں حضرت رکن الدین ملتانیؒ اور حضرت چراغ دہلیؒ نے قبر میں اتارا۔ ان کے روضہ پر پہلا گنبد محمد بن تغلق نے بنایا تھا۔ آئندہ سطور میں حضرت نظام الدین اولیاء کی فقہی بصیرت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

۱۔ سیرت خواجہ نظام الدین اولیاء المعروف محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۱۱

فقہی بصیرت

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو قرآن کریم، تفسیر، قرآت و تجوید، حدیث، فقہ و اصول فقہ، شعر و ادب اور اصلاحِ امت سے خصوصی شغف رہا۔ان کی طرف منسوب ملفوظات میں "فوائد الفواد" اور "سیر الاولیاء" کو مفصل اور مستند ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ اول الذکر میں انہوں نے تزکیہ نفس، زہد و تقویٰ، اسلام کے ارکان، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اتحاد اسلامی، اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی بیداری اور سماجی انصاف وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اپنے افکار و نظریات پیش کئے ہیں۔

دراصل یہ کتاب حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے حضرت خواجہ امیر حسن علاء سجزی دہلوی نے جمع کیا ہے۔اس کا اردو ترجمہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے کیا ہے۔اسے پہلی بار ۱۹۹۰ء میں اردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر اس کا تیسرا ایڈیشن ہے، جس کے تحت حضرت شیخ المشائخ کی فقہی بصیرت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان کے بعض افکار ایسے ہیں جو جمہور علماء کی آراء سے مطابقت رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو منفرد اور نادر ہیں۔ مقالہ نگار نے اس میں دونوں حوالوں سے گفتگو کی ہے اور اس میں پہلے قرآن، حدیث سے اخذ شدہ مسائل اور آخر میں بعض منفرد فقہی مسائل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

فقہی امور میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ زیادہ تر آراء میں انہوں نے حنفی مسلک کو ترجیح دی ہے، البتہ بعض مسائل جیسے حلّت سماع، قرائت فاتحہ خلف الامام، ایام ابیض کے روزے اور صلوۃ الجنازہ علی الغائب وغیرہ میں انہوں نے امام شافعی کی پیروی کی ہے۔اس لحاظ سے انہیں مجتہد کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیوں کہ انہوں نے کسی ایک امام فقہ کی پیروی نہیں کی ہے۔

ایک فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ حدیث پر بھی اس کی گہری نظر ہو اور اس کے اصول و قواعد اور حقیقی مفہوم سے واقف ہو چناں چہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ حال تھا کہ اگر ان کے سامنے حدیث اور مشائخ کا قول پڑھا جاتا تو وہ دونوں میں فرق بآسانی کر لیتے تھے۔ایک بار ان سے "من لیس له

شیخ فشیخه ابلیس "اور" من لم یر مفلحاً لایفلح ابداً" کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا ان کا شمار حدیثوں میں ہوتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: "نہیں، یہ مشائخ کے اقوال ہیں"۔[۱]

بسااوقات ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے اس سلسلے میں حاضرین کی اصلاح بھی فرمائی۔ ایک مشہور حدیث "الصوم لی و انا اجزی به "[۲] سے متعلق حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسے ان الفاظ "الصائم لی" کے ساتھ بھی سنا گیا ہے تو شیخ المشائخ نے فرمایا! تو پھر "انا اجزی له" آنا چاہیے تھا اور پھر اسے بتایا کہ "ب" دراصل "ل" کے معنی میں مستعمل ہے۔[۳]

اسی طرح ایک شخص نے شیخ المشائخ کے سامنے "من احب العلم و العلماء لم یکتب خطیئته" پیش کی اور کہا کہ میں ایسا کرتا ہوں تو مجھے امید ہے کہ میرے گناہ نہیں لکھے جائیں گے تو انہوں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے فرمایا کہ سچی محبت سے مراد پیروی ہے اور جب کوئی شخص ان کا محب ہو جائے گا تو ان کی پیروی بھی ضرور کرے گا اور نامناسب چیزوں سے دور رہے گا اور جب یہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے گناہ نہیں لکھے جائیں گے۔[۴]

۱۔ **قرآنی تعلیمات**: محبوب الٰہیؒ کی قرآن کریم پر گہری نظر تھی، اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآنی تعلیمات اور اس کے احکام کو دس نکات میں بیان کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں سے آٹھ تو صرف سورۃ الفاتحہ میں ہی ہیں، یعنی ذات (الحمد)، صفات (الرحمن الرحیم)، افعال (رب العالمین)، آخرت (مالك یوم الدین)، تزکیہ (ایاك نعبد)، تخلیہ (وایاك نستعین)،

۱۔ دہلوی، علا سجزی، خواجہ امیر حسن، فوائد الفواد، ص ۷۶۹
۲۔ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، جلد سوم، ص ۱۴۹
۳۔ فوائد الفواد، ص ۸۸۹
۴۔ ایضاً، ص ۹۲۵

اولیاء کا ذکر(اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم) اور دشمنوں کا ذکر(غیر المغضوب علیھم و لاالضالین)وغیرہ البتہ جہاد اور احکام شرع کا تذکرہ الگ سے کیا گیا ہے۔[۱]

۲۔قرآن کریم کی تلاوت کے آداب: حضرت سلطان المشائخ نے ایک محفل میں تلاوت قرآن کے آداب بتاتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ تردید کا کیا مطلب ہے؟فرمایا کہ جس آیت سے پڑھنے والے کو ذوق اور رقت حاصل ہو اس کی تکرار کرنی چاہیے۔ دلیل میں انہوں نے نبی کریمؐ کے عملِ مبارک کو بیان کیا ہے کہ وہ ایک بار بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کوئی سورہ پڑھنا چاہ رہے تھے، لیکن بسم اللہ سے ہی ان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بیس بار اس کی تکرار فرمائی۔[۲]

۳۔ختم قرآن کے بعد سورہ فاتحہ اور بقرہ کی چند آیتیں پڑھنا: حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے درج بالا سوال کے جواب میں فرمایا کہ نبی کریمؐ سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے؟انہوں نے فرمایا:"الحال و المرتحل"۔پھر اس کی تشریح میں فرمایا کہ "الحال" اسے کہتے ہیں جو کسی پڑاؤ پر آکر اترے اور "مرتحل" اسے کہتے ہیں جو روانہ ہو جائے۔یہ اشارہ اس طرف ہے کہ جب کوئی قرآن پڑھتا ہے اور ختم کرتا ہے تو گویا ایک منزل آکر اترتا ہے اور جب دوبارہ شروع کرتا ہے تو گویا دوبارہ روانہ ہو جاتا ہے۔ایسے شخص کو رسول اللہؐ نے "الحال والمرتحل" کی صفت سے یاد کیا ہے۔[۳]

۴۔غائبانہ نماز جنازہ: حضرت نظام الدین اولیاءؒ غائبانہ نماز جنازہ کے قائل ہیں اور وہ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ سلم کا طرزِ عمل پیش کرتے ہیں کہ آپؐ نے نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی

۱۔ فوائد الفواد، ص ۴۳۹

۲۔ ایضاً، ص ۴۲۵

۳۔ ایضاً، ص ۶۷۵

تھی۔اس سلسلے میں وہ امام شافعیؒ کی پیروی کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر میت کے جسم کا کوئی عضو جیسے ہاتھ یا پاؤں یا انگلی جو بھی ہو،اس پر نماز پڑھی جائے گی۔[1]

۵۔**روزہ**: حضرت نظام الدین اولیاء نے اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن یعنی روزہ اور اس کے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔انہوں نے اس سلسلے میں فرمایا کہ آداب درویشی یہ ہیں کہ تہائی سال کا روزہ رکھا جائے یعنی ایک سال میں چار مہینے۔چناں چہ وہ نبی کریمؐ کے ایک عمل (آپؐ ہر ماہ تین روز روزہ رکھتے تھے البتہ یہ نہیں معلوم کہ وہ تین روزے کون سے ہیں؟) سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر ہفتے میں دو دن روزہ رکھیں مثلاً پیر اور جمعرات کو تو اس طرح بھی تہائی سال ہو جائے گا۔[2]

سلطان المشائخ کی فقہی بصیرت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں دو حدیثوں کے درمیان تطبیق دینے میں ملکہ حاصل تھا۔روزے کے سلسلے میں نبی کریمؐ سے مروی دو حدیث (۱) "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے نہ روزہ رکھا، نہ افطار کیا۔" (۲) "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس پر دوزخ تنگ ہو گئی" کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرمایا:

> "پہلی حدیث سے مراد یہ ہے کہ جس نے پیوستہ روزے رکھے تو ان میں وہ پانچ روز دونوں عیدوں اور ایام تشریق کے بھی ہوئے۔بس یہ ایسا ہوگا کہ اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔دوسری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے متواتر روزے رکھے مگر ان پانچ دنوں میں افطار کیا تو اس پر دوزخ تنگ ہو گئی۔"[3]

۶۔**تراویح کی حقیقت**: حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تراویح کو سنت قرار دیا ہے۔ان سے پوچھا گیا کہ یہ رسول اللہؐ کی سنت ہے یا صحابہ کی؟فرمایا کہ صحابہ کرام کی سنت ہے اور اس سوال پر کہ کیا صحابہ کی

۱۔ فوائد الفواد، ص ۶۷۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۹

۳۔ ایضا، ص ۲۵۱

سنت کو بھی سنت میں شمار کیا جائے گا؟ کہا کہ ہاں! ہماری فقہ (فقہ حنفی) میں شامل ہے، البتہ فقہ شافعی میں سنت بس سنت رسولؐ ہے۔[۱]

۷۔ **طبقاتِ امت کا ذکر**: سلطان المشائخ نے ایک حدیث کے حوالے سے امت کو پانچ طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی مدت چالیس سال بیان کی ہے نیز ان کی خصوصیات بتائی ہیں۔ اس میں پہلا طبقہ علم اور مشاہدے کا ہے جس سے مراد صحابہ کرام ہیں۔ دوسرا بِر (نیکی) اور تقویٰ کا طبقہ ہے جس سے مراد تابعین کرام ہیں۔ تیسرا طبقہ تواصل وتراحم[۲]، چوتھا تقاطع وتدابر[۳] اور پانچواں طبقہ ہرج اور مرج[۴] کا ہے۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ اب یہ دو سو سال نبی کریمؐ کی وفات کے بعد پورے ہو چکے ہیں، ان دو سو سالوں کے بعد آدمی کے بچے سے کتے کا بچہ پیدا ہونا بہتر ہوگا، لیکن آج کل کے بارے میں آدمی کیا کہے؟[۵]

۸۔ **تائب اور متقی دونوں برابر ہیں**: حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تائب اور متقی دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے اور دلیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک پیش کیا ہے:

> التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔ ترجمہ: "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔"

اس کی تشریح میں وہ فرماتے ہیں کہ متقی تو وہ ہوتا ہے جس نے مثلاً ساری عمر کبھی شراب نہ پی ہو یا اور کوئی گناہ اس سے نہ ہوا ہو اور تائب وہ ہوتا ہے جس نے گناہ کیا اور پھر توبہ کر لی۔ یعنی جس نے گناہ کیا اور

۱۔ فوائد الفواد، ص ۷۳۷

۲۔ تواصل یعنی جب ان کے پاس دولت آتی ہے تو اگر وہ ان کے اور دوسروں کے درمیان مشترک ہو تو یہ اپنے شراکت داروں کے پاس اسے نرمی اور رعایت سے جانے دیتے ہیں اور تراحم یعنی اگر ان کو دولت مل جائے تو وہ اسے راہ حق میں خرچ کر دیتے ہیں

۳۔ یعنی اگر انہیں دولت مل جاتی ہے تو اس کی حصہ داری میں لوگوں سے قطع تعلق اور دشمنی پر اترتے ہیں اور تدابر سے مراد یعنی وہ لوگ جن کو دولت مل جائے تو پوری رکھ لیں اور کسی کو کچھ نہ دیں

۴۔ یعنی آپس میں ایک دوسرے کا گوشت نوچنے اور قتل کرنے والے

۵۔ فوائد الفواد، ص ۴۹۷

گناہ سے خوب ذوق پایا جب وہ توبہ کرتا ہے اور اطاعت کرتا ہے تو اس اطاعت میں بھی خوب ذوق پاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس راحت کا ایک ذرہ جو اسے اطاعت میں حاصل ہوا، وہ ذرہ گناہوں کے کھلیان کے کھلیان جلا ڈالے۔[1]

۹۔ **دنیا سے بے نیازی**: حضرت محبوب الٰہیؒ نے دنیا میں مال و دولت جمع کرنے کو پسند نہیں کیا اور اس حوالے سے ایک حدیث پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے حلال پر عذاب ہوگا اور حرام پر (بھی) عذاب ہوگا۔ لوگوں نے سوال کیا کہ حرام پر عذاب کی بات تو سمجھ میں آنے والی ہے لیکن حلال پر عذاب کیسے ہوگا؟ انہوں نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ ایک شخص کو قیامت کی دھوپ میں کھڑا کیا جائے گا اور حساب مانگا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ یہ عذاب ہوگا۔[2]

۱۰۔ **مجلس میں بیٹھنے کے آداب**: حضرت نظام الدین اولیاء نے نبی کریمؐ کی مشہور حدیث[3] سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کوئی کسی مجلس میں جائے تو جہاں خالی جگہ ملے وہیں بیٹھ جائے کیوں کہ آنے والے کی وہی جگہ ہوتی ہے اور اس میں اونچی نیچی جگہوں کا خیال نہ کیا جائے۔ اگر جگہ نہ ہو تو حلقے کے پیچھے بیٹھے، بیچ میں نہیں بیٹھنا چاہیے کہ جو ایسا کرتا ہے وہ ملعون ہوتا ہے۔

۱۱۔ **دینی اخوت کو خونی اخوت پر ترجیح دینا**: حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ہمیشہ لوگوں کو اخوت اور بھائی چارگی کی تلقین کی اور کہا کہ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ اخوت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک اخوت رشتہ داری کی ہے تو دوسری اخوت دین کی ہوتی ہیں اور ثانی الذکر میں ہی زیادہ مضبوط اور پائے دار اخوت ہوتی ہے کیوں کہ اگر دو نسبتی بھائی ہوں اور ایک مومن ہو اور ایک کافر تو پہلے کی میراث کافر بھائی کو نہیں ملے گی۔ اس لیے میں اس اخوت کو کچا پاتا ہوں اور اس کے برعکس دینی اخوت پکی ہوتی ہے کیوں کہ جو رشتہ دو دینی بھائیوں میں ہوتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں برقرار رہتا ہے۔[4]

۱۔ فوائد الفواد، ص ۱۸۹

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۷

۳۔ ایضاً، ص ۳۰۳

۴۔ ایضاً، ص ۴۸۳

۱۲۔**حلّتِ سماع**: حضرت نظام الدین اولیاءؒ بعض شرطوں کے ساتھ سماع کے جواز کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی فکر کے برعکس حضرت امام شافعیؒ کا قول پیش کرتے ہیں کہ وہ سماع کو دَف اور چغانہ کے ساتھ مباح رکھتے ہیں، البتہ اگر اس میں چنگ و رباب اور مزامیر شامل ہو جائے تو غیر شرعی ہوگا۔ شیخ المشائخ کے مطابق:

> "جب چند چیزیں موجود ہوں اسی وقت سماع سنا جاتا ہے، یعنی مسمع و مسموع و مستمع اور آلہ سماع۔ مسمع گویا ہے۔ وہ ایسا آدمی ہونا چاہیے جو مرد ہو عمر رسیدہ۔ بچہ نہ ہو اور عورت نہ ہو۔ مسموع یہ ہے کہ جو کچھ گایا جائے وہ ہزل اور فحش نہ ہو اور مستمع جو کچھ سنا جائے وہ حق کے لیے سنا جائے اور وہ حق یاد سے مملو ہو۔ اور آلہ سماع وہ مزامیر ہیں جیسے چنگ و رباب اور اسی طرح کی چیزیں وہ درمیان میں نہ ہوں۔ ایسا سماع حلال ہے۔[1]

۱۳۔**مزامیر کی حرمت**: حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مزامیر (پھونک سے بجائے جانے والے باجے) اور اسی قبیل کی دیگر چیزوں کو ناپسندیدہ اور حرام قرار دیا ہے۔ دلیل میں وہ نماز کی حالت میں عورت کا امام کو اپنی ہتھیلی کی پشت پر ہاتھ مار کر غلطی سے آگاہ کرنے کے عمل کو پیش کرتے ہیں کہ جب وہ نماز میں تالی نہیں بجا سکتی کیونکہ اس سے کھیل کی مشابہت ہوتی ہے تو سماع میں تو اور بھی جائز نہیں ہوگا۔[2]

۱۴۔**عدل اور ظلم**: اشاعرہ کا ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مومن کو دوزخ میں ہمیشہ کے لیے ڈال دے اور کافر کو جنت میں ہمیشہ کے لیے رکھے، تو اس کا یہ عمل درست ہوگا کیوں کہ اس نے اپنی ملکیت میں ہی تصرف کیا ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے عدل کے خلاف عمل اور ظلم قرار دیا ہے۔ دلیل میں سورہ زمر کی آیت نمبر ۹ سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ مومن بہشت میں رہے اور کافر دوزخ میں، کیوں کہ وہ حکیم ہے اور تمام کام حکمت کے مطابق کرتا ہے جیسے کسی کے پاس مال ہو وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، لیکن وہ اپنے مال

۱۔ فوائد الفواد، صفحات ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۵۱۵

کو اگر کنویں میں ڈال دے تو یہ حکمت نہ ہو گی لہٰذا مومن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا کیوں کہ وہ ایمان کے ساتھ گیا ہو گا۔[۱]

حضرت نظام الدین اولیاء کے بعض افکار کا تنقیدی جائزہ

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف منسوب کتاب "فوائد الفواد" میں ان کی فقہی بصیرت کے اعلیٰ نمونے بہ کثرت ملتے ہیں، البتہ ان کے بعض فقہی افکار و نظریات ایسے ہیں جو نادر ہیں اور جمہور علماء کی آراء سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کے بعض افکار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جارہا ہے :

۱۔ **سجدہ تعظیمی کا جواز**: حضرت محبوب الٰہیؒ سجدہ تعظیمی کے قائل نظر آتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی چیز فرض رہی ہو اور اس کی فرضیت منسوخ ہو جائے تو بھی استحباب باقی رہتا ہے، جیسے کہ ایام ابیض اور ایام عاشورہ کے روزے ماضی کی امتوں پر فرض تھے، لیکن اب مستحب ہیں۔

اسی طرح سجدہ تعظیمی پہلے مستحب تھا، چناں چہ رعیت بادشاہ کو، شاگرد استاد کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کیا کرتی تھی۔ عہد رسالت میں سجدہ کا حکم منسوخ ہو گیا تو اگر استحباب چلا گیا تو اباحت تو باقی رہی۔ اگر مستحب نہیں تو مباح ہو گا اور مباح سے انکار اور ممانعت کہاں سے آئی ہے؟[۲]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرضیت سے دلیل دی ہے جب کہ خود ان کے مطابق ماضی میں سجدہ تعظیمی فرض نہیں بلکہ مستحب تھا تو فرضیت کا حکم مستحب پر کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے؟ نیز مختلف احادیث نبوی اس کے جواز کا انکار کرتی ہیں جیسا کہ نبی کریمؐ کا فرمان مبارک ہے:

> "جو شخص پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے لیے دست بستہ کھڑے ہوں، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"[۳]

۱۔ فوائد الفواد، ص ۵۶۷

۲۔ ایضاً، ص ۷۲۳

۳۔ سجستانی، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابوداؤد، مترجم: ابو عمار عمر فاروق سعیدی، کتاب الادب (جلد ۴)، ص ۸۸۸، حدیث نمبر ۵۲۲۹

اسی طرح ایک روایت میں ملتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے عملاً آپؐ کو سجدہ کیا۔ رسول اللہؐ نے پوچھا: اے معاذ! یہ کیا ہے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ میں ملک شام گیا تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی رہنماؤں کو سجدہ کرتے ہیں، اس بنا پر میرے دل نے چاہا کہ آپؐ کو سجدہ کروں۔ آپؐ نے فرمایا:

"ایسا مت کرو اور اگر غیر اللہ کے لیے سجدہ روا ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ خاوند کی حق ادائیگی کے لیے اسے سجدہ کرے۔"[1]

علامہ ابن تیمیہؒ بھی اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں، چناں چہ وہ اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سجدہ تعظیم میں مسجود کی تعظیم ہوتی ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے تعظیم کا یہ انداز اختیار کریں، البتہ ہم سے پہلے لوگوں کے لیے ایسا کرنا جائز تھا۔"[2]

۲۔ نیک انسان کو نبی کریمؐ کے ساتھ برابر کا درجہ دینا : حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نبی کریمؐ کی ایک حدیث جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا وہ کل بہشت میں میرے ساتھ ایک جگہ ہوگا اور دونوں انگلیوں (انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی) کو ملا کر اشارہ فرمایا ایسے.....، کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد صرف یہی نہیں کہ وہ شخص آپؐ کے ساتھ ہوگا، بلکہ اسے بھی وہی درجہ دیا جائے گا، کیوں کہ لوگوں کی انگلیوں کے برعکس نبی کریمؐ کی انگشت شہادت اور درمیان کی انگلیاں برابر تھیں۔[3]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ فرمانا کہ نبی کریمؐ کی انگشت شہادت اور درمیان کی انگلیاں برابر تھیں، خلافِ واقعہ ہے، کیوں کہ اس کا ذکر سیرت کی بنیادی مآخذوں میں باوجود تلاش بسیار کے راقم کو نہیں ملا۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس کا تذکرہ سیرت نگاروں نے ضرور کیا ہوتا کیوں کہ یہ ایک خلاف معمول

۱۔ ابن ماجہ،، سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۱۸۵۳

۲۔ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ، مجموع فتاوی، جلد ۴، ص ۳۶۰

۳۔ فوائد الفواد، صفحات ۸۹۱۔ ۸۹۳

بات ہے۔اس سلسلے میں راقم الحروف نے اپنے استاد محترم پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی جن کا شمار موجودہ دور میں ایشیا کے صف اول کے سیرت نگاروں میں ہوتا ہے، سے گفتگو کی تو انہوں نے بھی اس سے انکار کیا اور فرمایا کہ اس کا تذکرہ شمائل نبویؐ میں نہیں ہے۔ نیز حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ رائے کہ اس شخص کو نبیؐ کے برابر کا درجہ دیا جائے گا، قابلِ اتفاق نہیں ہے کیوں کہ کسی انسان کا درجہ نبی کریمؐ کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟جب کہ خود کسی نبی کا ہی درجہ آپؐ کے برابر نہیں ہے؟

۳۔**حبب الی من دنیاکم ثلاث** :حضرت شیخ المشائخؒ نے ایک مشہور حدیث "حُبِّبَ الیَّ من دنیاکم ثلاث:الطِّیبُ والنساءُ و جعلت قرۃ عینی فی الصلاۃ"[۱] کی تشریح میں فرمایا کہ "النساء"(عورت) سے مراد حضرت عائشہؓ ہیں، کیوں کہ دوسری بیویوں کی بہ نسبت ان کی جانب رسول اللہؐ کا میلان زیادہ تھا اور "قرۃ عینی فی الصلاۃ" سے مراد حضرت فاطمہؓ ہیں جو اس وقت نماز پڑھ رہی تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد نماز ہے لیکن اگر اس سے مراد نماز ہوتی تو نماز کو ان دونوں چیزوں پر مقدم رکھتے۔[۲]

درج بالا حدیث صحیح ہے اور نسائی (۳۹۳۹)، حاکم (جلد ۲، ص ۱۷۴) اور حافظ ابن حجر (جلد ۱۱، ص ۳۴۵) نے اسے روایت کیا ہے، البتہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خصوصی تشریح جمہور علماء کی آراء کے خلاف ہے۔ محدثین نے اس سے عام مفہوم یعنی خوشبو، عورت اور نماز ہی لیا ہے۔[۳]

یہی رائے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی بھی ہے۔[۴]

۴۔**قرآن کریم سے فال نکالنا**: حضرت نظام الدین اولیاء قرآن مجید کی فال دیکھنے کے قائل نظر آتے ہیں، چناں چہ جب ان سے اس حوالے سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہاں! اس بارے میں ایک

۱۔ نسائی، ابو عبدالرحمٰن، سنن نسائی (جلد ۲) ص ۴۵۴، باب حب النساء، حدیث نمبر ۳۹۳۹

۲۔ فوائد الفواد، ص ۹۱۵

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

https://makarem.ir/main.aspx?reader=۱&pid=۷۲۳۱۴&lid=۰&mid=۷۸۶۴۷

۴۔ یہ رائے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے راقم الحروف کو ایک انٹرویو میں بتائی تھی۔

حدیث بھی آئی ہے اور فرمایا کہ جب قرآن مجید کو فال کے لیے کھولیں تو سیدھے ہاتھ سے کھولیں اور الٹے ہاتھ سے مدد نہ لیں[۱]۔ البتہ انہوں نے اس حدیث کا ذکر نہیں کیا ہے اور علماء نے فال نکالنے سے منع کیا ہے خواہ وہ قرآن کریم کے ذریعہ ہو یا ستاروں سے۔[۲]

خلاصہ کلام

برصغیر کی تاریخ میں حضرت نظام الدین اولیاء کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے، اگرچہ ان کے بعض افکار و نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں کہ ان سے اختلاف نہ کیا جاسکے۔اللہ رب العالمین اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہی اس سے مستثنیٰ ہیں، دیگر افراد کی آرا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے لیکن اس سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مقام و مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

☆☆☆

۱۔ فوائد الفوائد، ص ۴۳۳

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: http://www.suffahpk.com/fal-nikalny-ki-sharai-hesiyat

منابع و مآخذ:

- ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، مترجم: عطاء اللہ ساجد، مکتبہ دار السلام، ریاض، ۱۴۲۸
- دہلوی، علا سجزی، خواجہ امیر حسن، فوائد الفواد، اردو اکادمی، دہلی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۹۲
- سجستانی، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابوداؤود، مترجم: ابو عمار عمر فاروق سعیدی، کتاب الادب (جلد ۴)، مکتبہ دار السلام، ریاض، ۱۴۲۸
- شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ، مجموع فتاوی، جلد ۴، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، مدینہ منورہ، ۲۰۰۴
- القادری، محمد حسیب، سیرت خواجہ نظام الدین اولیاء المعروف محبوب الٰہی، اکبر بک سیلرز، لاہور، غیر مطبوعہ،
- مسلم بن حجاج، صحیح مسلم (جلد سوم)، مترجم: علامہ وحید الزمان، خالد احسان پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۴
- نسائی، ابو عبد الرحمٰن، سنن نسائی (جلد ۲)، مترجم: علامہ وحید الزمان، اسلامی اکاڈمی، اردو بازار، لاہور

عرفان اسلامی میں مولانا رومی کا مقام

مؤلف: مولانا مہدی باقر خان

عرفان، خود شناسی سے خدا شناسی تک کے اس مقدس سفر کا نام ہے جس میں انسان کائنات و مافیہا کو چشم بصیرت سے دیکھتا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو انسانی جان و روح میں ایسے اثرات مرتب کرتا ہے کہ اس کا وجود، عشق الٰہی کا سراپا بن جاتا ہے اور پھر اس کا قد اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر آسمانی نشانیوں کا ادراک کرنے لگتا ہے. در اصل یہ انسانی حیات کا جوہر، معشوق حقیقی تک پہنچنے کا دلکش راستہ اور پاکیزہ عشق کا عملی کارنامہ ہے، چنانچہ عرفاء؛ اللہ کے علاوہ محض ان ہی کی محبت کو لازم جانتے ہیں جن سے خود اللہ نے محبت کی ہے۔ یہ خود پسندی کی بیماریوں سے بَری اور مادیت کے قید خانوں سے آزاد تاہم اسرار و اقدار بندگی کے اسیر ہوتے ہیں؛ ایسے عارف، عارف باللہ اور ایسا عرفان، عرفان اسلامی کہلاتا ہے۔

حسین انصاریان اس مقدس جذبہ کی اصل و بنیاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اس تفکر کے نقطۂ آغاز کی جستجو ایک غیر ضروری امر ہے کیونکہ یہ وہ حس ہے جو روز اول سے انسانی جان و روح میں موجود ہے فرق یہ ہے کہ بعض افراد اس حس کو بیدار کر لیتے ہیں اور بعض اسے اپنے اندر محسوس کئے بغیر ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں چنانچہ ہم خدا کو ہی اس کیفیت کا سرچشمہ پاتے ہیں جس نے بشری قلوب کو یہ صلاحیت ودیعت کی اور پھر اپنے مخصوص رہنماؤں کے ذریعے اسے وہ جلا بخشی تاکہ لوگوں کو عرفان حاصل ہو سکے ورنہ فکر بشری کی طنابیں ٹوٹ جاتیں اور اس تک رسائی نہ ہو پاتی"۔[۱]

۱۔ حسین انصاریان، عرفان اسلامی، ص ۵

اسلامی تصوف یا عرفان دو الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے جسے اس کی روح اور جسم کہا جاسکتا ہے۔ اس کی نوعیت ان دونوں حصوں کے باہمی ارتباط کو جاننے سے معلوم ہوتی ہے۔ دیوان شمس میں رومی کے اس پر تاکید اور مثنوی معنوی سے اس کی شروعات کے ذریعے، اسلامی تصوف و عرفان کی روح کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی؛ بانسری کی شکایت اور بادشاہ اور کنیز کی محبت کی حکایت سے شروع ہوتی ہے جو خدا اور انسان کے مابین والہانہ رشتہ سے مستعار ہے تاہم خدا کی محبت ہی روح تصوف و عرفان ہے۔

یہ محبت ہی ہے جو بانسری کو اس کے کشت زار کی مشتاق اور درد وفراق کی داستان کو بیان کرنے والی بناتی ہے اور اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی چاہت کا اشارہ دیتی ہے چنانچہ اگر تصوف و عرفان میں ایک قسم کی جمالیاتی حِس، نظر آتی ہے تو وہ بھی اس کے عاشقانہ نقطہ نظر کا طفیل ہے۔

ممکن ہے مذہبی متون میں محبت کو خدا کے ساتھ انسان کے تعلقات کی بنیاد کے طور پر صراحتا بیان نہ کیا گیا ہو مگر مکتب عرفانی، الٰہیات کے اس عاشقانہ اور جمالیاتی نظریہ کی نشاندہی کرتا ہے جس میں انسان اور اس کے معشوق حقیقی کی درمیان دوطرفہ عطوفتوں کے جذبہ اور احساسات موجزن ہوتے ہیں تاہم اسکا منبع خداوند کریم کی ذات والا صفات ہی ہوتی ہے:

آتش عشق است کاندر نی فتاد　　جوشش عشق است کاندر می فتاد[1]

ترجمہ: وہ عشق کی آگ ہی ہے جو نی یا بانسری میں روشن ہے اور یہ عشق ہی ہے جو می میں موجزن ہے۔

تاہم یہی محبت ہے جو انسانی بقا کی ضامن ہے، انسان؛ عشق، معرفت و عقلانیت ایسے کئی مخصوص جذبوں سے سرشار ہے جس سے فرشتے بھی بے بہرہ ہیں. یہی معرفت ہی وہ مقام ہے کہ جب تک انسان اس کے اعلی درجے پر نہ پہنچ جائے اور خدا اور اولیائے خدا کے سوا کسی سے دل نہ لگائے، وہ معشوق حقیقی سے محبت کے لائق نہیں بن پاتا لہٰذا عرفان اور اس کی روح کا سنگ بنیاد خدا کی معرفت پر مبنی محبت ہے۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ عرفاء کے مطابق یہ معرفت و محبت کسی فرد کی ریاضتوں و مجاہدتوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ خدا خود اپنے مقربین کا انتخاب کرتا ہے:

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش اول، بیت ۱۱

عطار نیشاپوری کے بقول یہ نکتہ صوفی فکر کا ایک خاص پہلو ہے کہ حضرت حق کی عنایات و اور ہدایات اس کی رازدارانہ عطا اور تحفہ ہے جسے محض اپنی کوششوں کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔[۱]

اپنے بندوں کی محبت پر خدا کی محبت کی مقدم ہے اس آیہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ[۲] سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ مقدس احساس اور والہانہ عنایت کا ادراک، عرفاء اور خداوند کریم کے مابین روابط کی راہ کو ہموار کرتا ہے اور صوفیا و عرفا کا سفر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ عشق اور محبت پر مبنی یہ رشتہ؛ عام طور سے معاشرہ میں رائج، عبادت گزار اور دیوتا کے درمیان زہد و تعبدِ خشک پر مشتمل رشتے کی جگہ لے لیتا ہے۔اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ قرب خدا کی مسلسل تلاش؛ تصوف کا اصول، روح اور ناگزیر نتیجہ ہے؛ چونکہ عارف باللہ کی اکلوتی خواہش اور اسکی خستگی ناپذیر جستجو، وصال اور لقاء اللہ ہوتا ہے۔اس پاکیزہ فکر کے پیش نظر، عارف؛ مذہب کو مقصد نہیں... وسیلہ مانتا ہے اور اس کے نزدیک مذہب؛ سختیوں کا نام نہیں بلکہ آسانیوں کی راہ بن جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ کائنات کو عشقِ الٰہی کے آئینے سے دیکھنے لگ جاتا ہے:

علت عاشق زِ علت ہا جدا است　　عشق اسطرلاب اسرار خدا است[۳]

ترجمہ: عشق کا سبب جملہ اسباب سے جدا ہے۔ عشق اسرار الٰہی کا لامتناہی اور نامحدود سلسلہ ہے۔

فروزانفر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

"چونکہ محبت؛ روح کو نرم اور دل کو معرفتوں کے لئے ہموار کردیتی ہے، اس لئے رومی نے اسے ایک اسطرلاب (Astrolabe) کے ساتھ تشبیہ دی ہے"[۴]۔

عرفا کا دین اسی محبت کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اور دراصل ان کے یہاں محبت کو مذہب پر بالا دستی حاصل رہتی ہے اور وہ انکے لئے قرب خدا کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا رومی کے نقطہ نظر اور عرفا کی رو

۱۔ عطار نیشابوری، فرید الدین محمد منطق الطیر، ص ۴۶۳

۲۔ سورہ مائدہ، آیت ۵۴

۳۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش ششم، بیت ۹

۴۔ فروزانفر، بدیع الزمان، شرح مثنوی شریف

سے عرفان اسلامی کی دو بنیادی خصوصیات ہیں: اول یہ کہ اس میں دین کے ظاہری آداب و رسوم سے زیادہ اس کے فلسفہ اور معنویت پر توجہ کی جاتی ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ انسان کو حضرت حق کی محبت کا اسیر بنا دیتا ہے اور یہ کیفیت اسے مشکلات سے نکال کے آسائش خاطر فراہم کر دیتی ہے، البتہ ہر شخص کی انفرادی صورت حال کے مطابق!

کشف و شہود

اسلامی تصوف کا دوسرا بنیادی عنصر، کشف و شہود ہے جو منبعِ معرفت ہے۔ گو کہ یہ محض تصوف سے مخصوص نہیں ہے یہ فن اور فلسفہ میں بھی ہے، لیکن اس کی سب سے مکمل، با قاعدہ اور سب سے منظّم شکل عرفان و تصوف میں ہی نظر آتی ہے:

آن کہ از حق یابد او وحی و جواب ہرچہ فرماید بُوَد عین صواب[1]

ترجمہ: جسے حضرت حق سے وحی آتی ہو اور اس کے سوالوں کے جواب آتے ہوں، وہ جو کہے گا وہ بالکل درست کہے گا۔

حقیقت میں عرفا کا مقام بہت بلند ہے جیسا کہ امام صادق (ع) فرماتے ہیں: لیس العلم بالتّعلم، إنّما هو نورٌ فی قلب مَن یُرید الله تبارک و تعالی أن یَهدیه۔ ترجمہ: علم کسب محض نہیں ہے۔ یہ ایسا نور ہے کہ خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے دل میں اسے قرار دیتا ہے۔[2]

وحدت وجود

خدا وہ ذات ہے جس کے ساتھ عرفا راز و نیاز کرتے ہیں۔ خدا سے متعلق یہ نظریہ صوفیوں اور ادیان و مذاہب میں یقین رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہے، حالانکہ ایک عارف کا خدا سے رشتہ اور

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش نہم، بیت ۲۲۵

۲۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار (جلد ۱)، صفحہ ۲۲۵

مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا اپنے معبود سے ربط کی نوعیت مختلف ہے چونکہ ہر کس و ناکس عارفانہ نقطہ نظر کا متحمل بھی نہیں ہوتا ہے۔

سلوک

تصوف کا ایک اہم عنصر جو صوفیانہ طریقہ حیات کو عام طرز زندگی سے ممتاز کرتا ہے۔ سیر و سلوک یعنی، روح کے ساتھ مجاہدت، نفس پر قابو اور جذبہ اطاعت کے ساتھ اسکی راہ میں سراپا تسلیم ہونا ہے تاہم اس سفر کا آغاز، جہاں تک سالک کی کوشش کا تعلق ہے، توبہ سے شروع ہوتا ہے۔

کامل انسان

کامل انسان؛ عارف باللہ ہونے کی ایک مثال ہے مولانا رومی مختلف مقامات پر اس نکتے پر تاکید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

خود ضمیرم را ہمی دانست او زانکہ سمعش داشت نور از شمع ہو
بود پیشش سرّ ہر اندیشہ‌ای چون چراغی در درون شیشہ‌ای[1]

ترجمہ: وہ میرے مافی الضمیر سے آگاہ ہے چونکہ اس کی باطنی سماعت نورالہی سے مزین تھی۔اس پر ہر راز ہر نیت آشکارا تھی۔ ٹھیک اس چراغ کی طرح جو شیشہ میں ہوتے ہوئے سب کو شفاف طریقے سے دیکھ سکتا ہے۔

ظاہر ہے عرفان اسلامی کی صحیح تفہیم کے لئے سچے عرفاء کے احوال سے آشنائی ناگزیر ہے۔ دھیان رہے عرفاء کی سب سے اہم خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ کسی بھی راستہ سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جہاں وہ ذات خداوندی میں سب کچھ پالیتے ہیں وہیں ساری چیزوں میں خدا کو تلاش کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اگر ہم عرفان کے حوالے سے ادبی دنیا میں بھی اس کے آفاقی نقوش و اثرات تلاش

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر چہارم، بخش دوم، بیت ۶۹۴

کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں ایسے ایسے نوابغ روزگار موجود ہیں جن کی مثال اس عہد قحط الرجال میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہے، مثلاً ابوسعید ابوالخیر (متوفی ۴۴۰ھ) ادبیات عرفانی کا اتنا معتبر نام ہے کہ ان کے ایک قول سے جو کہ مذکورہ خصوصیت کے عرفا کے تناظر میں ہے، ان کی عظمتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ دنیا کا ذرہ ذرہ خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

ظاہر ہے کہ خداجوئی اور توحید پرستی کا ایسا آفاقی نقطۂ نظر اسی کا ہوسکتا ہے جو کائنات کی تمام مخلوقات بالخصوص انسانوں کو بلا تفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل اور قوم و قبیلہ محترم جانتا ہو، چنانچہ عرفا ہمیشہ انسان دوست رہے ہیں، خدا کی اس اشرف مخلوق کو ہمیشہ مائل بہ ارتقاء دیکھنا پسند کیا ہے انسان سازی کی عملی کوششیں کرتے ہیں اور مذہب کو انسان سازی کا بہترین وسیلہ قرار دیتے ہیں اور جو مذہب آدمی کو اچھا انسان نہ بنائے وہ اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتے یہی نہیں بلکہ عرفاء یہاں تک قائل ہیں کہ آدمی کا مسلمان و کافر، یہودی، بودھ اور زرتشت ہونے سے پہلے انسان ہونا ضروری ہے۔

عرفاء کے اس نقطۂ نظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو نہ فقط انسان بلکہ انسان کامل دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ اپنا خودشناسی سے خداشناسی تک کا سفر اسی نہج پر طے کرتے ہیں تاکہ اگر انسان کامل نہ بن سکیں تو انسان سالم تو ضرور بن جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ مائل بہ اصلاح رکھتے ہیں اور اپنے بارے میں حسن ظن اور خودپسندی سے کام نہیں لیتے جیسا کہ ابوسعید کہتے ہیں:

"جو کوئی اپنے آپ کو نیک خو تصور کرتا ہے خود کو نہیں پہچانتا۔"

اس موقع پر اگر امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی حدیث من عرف نفسہ فقد عرف ربہ[1] یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا، دہرائی جائے تو بات مکمل نظر آتی ہے۔ البتہ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی حد تک انتہائی نقاد ہوتے ہیں مگر دوسروں کے سلسلے میں از حد پاک بیں ہوتے ہیں، انہیں دنیا کی کوئی چیز معیوب نظر نہیں آتی بلکہ وہ اسے ایسے مثبت اور تعمیری نقطۂ نظر سے دیکھتے

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، حضرت علی علیہ السلام

ہیں کہ وہ خوبصورت ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے جو بقول بو علی سینا: "عرفاء اور صوفیاء ظاہراً ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں"۔

واضح رہے کہ اس سلسلے میں مولانا جلال الدین بلخی معروف بہ رومی (متوفی ۶۷۲) کے افکار ہمیشہ سرفہرست میں رہیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی مثنوی کے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

خیر مطلق نیست زین ہا ہیچ چیز　　شر مطلق نیست زین ہا ہیچ چیز[1]

ترجمہ: دنیا کی کوئی شئے خیر مطلق یا شر مطلق نہیں ہے۔

یعنی کوئی چیز نہ خیر مطلق ہے اور نہ شر مطلق، ظاہر ہے کہ یہ وہ طرز فکر ہے جو عرفا میں ہی پائی جاتی ہے ورنہ دنیا میں اکثریت کے نظریات بہت اچھے یا بہت خراب کے افراط و تفریط کے شکار ہیں مگر عرفاء کے عارفانہ نقطہ ہائے نظر انہیں ایسا توازن و اعتدال بخشتے ہیں کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں تاہم یہ عارفانہ خصوصیت و امتیاز دنیائے ادبیات میں مولانا روم کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مولانا روم نے مثنوی معنوی نامی اپنی مثنوی میں عرفانی اشعار کے وہ گہر پارے تراشے ہیں جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بعضوں نے اس مثنوی کو "صیقل الارواح" کا نام دیا ہے۔ کیوں نہ ہو مولانا نے آیات و احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے ایسے عرفانی اور اخلاقی موضوعات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے جس سے انسان سازی کے تئیں ان کی دل سوزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا وہ مفکر ہیں جو اپنی قوت فکر سے تمام مادی اور معنوی ظواہر کی گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کے عوارض کو الگ کرکے حقائق دریافت کر لیتے ہیں، کثرتوں میں وحدت تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی کو دکان وحدت اور دکان فقر قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے زندگی کی ناسازگاریوں اور ناہمواریوں کو توازن جانا ہے، فلسفہ توحید و حیات کا یہ تصور مولوی ہی کا حصہ ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

مثنوی ما دکان وحدت است　　غیر واحد ہر چہ بینی آن بت است[2]

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر ششم، بخش ۸۴، بیت ۲۵۹۸

۲۔ مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۴۷، بیت ۱۵۲۸-۱۵۲۹

ترجمہ: میری مثنوی وحدت کا مخزن ہے۔ اس یکتا و یگانہ کے علاوہ اگر کچھ نظر آئے تو سمجھنا بت ہے۔

مولانا رومی، الٰہی احکامات کے پکے حامی ہیں در حالیکہ ان کی آزاد بینی انہیں ہر راستہ سے خدا تک پہنچادیتی ہے البتہ ان کے نظری استدلال و براہین انہیں خدا تک پہنچانے سے قاصر ہیں کیونکہ "پای استدلالیان چوبین بُوَد و پای چوبین سخت بی تمکین بُوَد"۔

رومی؛ عرفان خداوندی کے سلسلے میں "صاحب دل داند آن را با دلش" کے قائل ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا روم، خدا اور انسان کے درمیان رابطہ کے سلسلے میں کسی معینہ موضوعیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی رو سے خود انسان کو اسے اپنی اصالت ذات و وجود میں تلاش کرنا چاہئے جس کو خالق و مخلوق کے درمیان نقطۂ ارتباط کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا خود کو سرحدوں، ملکوں اور جغرافیائی پابندیوں سے آزاد تصور کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے خود کو "باغ ملکوت" کا باشندہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

روزہا فکر من این‌ست و ہمہ شب سخنم — کہ چرا غافل از احوال دل خویشتنم
ز کجا آمدہ‌ام آمدنم بہرچہ بود — بہ کجا می‌روم آخر ننمایی وطنم
مرغ باغ ملکوتم نیم از عالم خاک — چند روزی قفسی ساختہ‌اند از بدنم[1]

ترجمہ: شب و روز مجھے یک فکر ستاتی ہے کہ میں اپنے احوال سے کیوں غافل ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں کیوں آیا ہوں۔ کہاں جارہاہوں۔ میرا وطن کہاں ہے۔ میں باغ ملکوت کا پرندہ ہوں۔ اس زمین کا باشندہ نہیں۔ یہاں میرے لئے صرف ایک پنجرہ ہے۔

علاوہ ازیں مولانا نے ایک اور مقام پر اپنی آفاقیت و ہمہ گیریت کو "لامکان" یا "بے جا" جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ دیوان شمس، غزل شمارۂ ۵۴

چہ تدبیر ای مسلمانان کہ من خود را نمی دانم — نہ ترسا نہ یہودم من نہ گبرم نہ مسلمانم
نہ شرقیم نہ غربیم نہ بریم نہ بحریم — نہ از کان طبیعیم نہ از افلاک گردانم
نہ از ہندم نہ از چینم نہ بلغار و سقسینم — نہ از ملک عراقیم نہ از خاک خراسانم
مکانم لامکان باشد نشانم بی‌نشان باشد — نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من از جان[1]

ترجمہ: اے مسلمانوں! میرے لئے کیا تدبیر ہے۔ میں نہ راہب ہوں نہ یہودی نہ گبر نہ مسلمان۔ نہ شرقی ہوں، نہ غربی ہوں نہ فطرت کے معدن سے ہوں نہ عالم افلاک سے۔ نہ ہندوستانی ہوں، نہ چینی نہ بلغار سے نہ سقسین سے۔ نہ عراق سے ہوں نہ خراسان سے۔ لامکانیت ہی میرا مکان ہے بے نشانی میرا نشان ہے۔ نہ تن رہے نہ جان کیونکہ میں جان جانان میں سے ہوں۔

مولانا رومی کی یہی عمیق، جامع اور دقیق وسعت نظر انہیں غیر معمولی اہمیت کے حامل فرزندان توحید کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے اور عرفانی ادبیات میں وہ مقام عطا کرتی ہے جہاں پہنچ کر انسان نہ صرف ناقابل فراموش بلکہ زندہ و جاوید ہو جاتا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی عرفان و تصوف پر گفتگو ہوتی ہے تو مولانا رومی ضرور یاد کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

---

[1]۔ دیوان شمس، غزل ۱۱۶

۲۔ مبانی عرفان واحوال عارفان، ص ۵۷۴

منابع و مآخذ

- عرفان اسلامی، حسین انصاریان، ناصر خسرو، کوچہ حاج نائب، تہران، ۱۳۶۳ش
- مبانی عرفان واحوال عارفان، ڈاکٹر علی اصغر حلبی، اساطیر، میدان فردوسی، تہران، ۱۳۷۷ش
- نہج البلاغہ، کلمات قصار، ترجمہ مفتی جعفر حسین
- مثنوی معنوی، مولانا جلال الدین محمد بلخی (مولوی)؛ کریم زمانی، انتشارات اطلاعات، ۱۳۸۹، تہران
- عطار نیشابوری، فریدالدّین محمد، منطق الطیر، تہران

شیعوں کی مذہبی اور سماجی بیداری میں خاندان اجتہاد کا مرکزی کردار

مؤلف: ڈاکٹر فیضان جعفر علی[۱]

مقدمہ

ہر دور میں باعمل علماء اور دانشمند حضرات کسی نہ کسی عنوان سے کسی نہ کسی تحریک کے بانی و موسس رہے ہیں۔ البتہ تاریخ میں بعض تحریکیں ایسی رہی ہیں جن کو ابتدا سے ہی باقاعدہ تحریک کے نام سے آگے بڑھایا گیا جس کے نتیجہ میں عوامی بیداری وجود میں آتی رہی ہیں لیکن بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ افراد کسی ایک نہج یا کسی ایک مقصد کے تحت کام کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کی نہج اور روش کو ان کے گذر جانے کے بعد تحریک کا نام دیا جاتا ہے، جس میں جگہ جگہ پر عوامی بیداری کے نمونے نظر آتے ہیں اور محققین حضرات ایسی تحریکوں اور بیداریوں کا مختلف پہلو سے مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے مفاد و معایب پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ خاندان اجتہاد کے علماء اور دانشمندوں اور اسی طرح ان کے خاص شاگردوں نے بر صغیر میں شیعہ مذہب کی شناخت اور اس کی بقاء و دوام کے لئے جو کارنامے اور کوششیں کی ہیں[۲] وہ کسی

۱۔ راقم الحروف نے حاشیہ ہی میں کتابوں کا مکمل حوالہ دیدیا ہے لہٰذا الگ سے کتابیات کے ذیل میں کتابوں کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ سید دلدار علی غفرانمآب صاحب نے شیعی اعتقادات اور فقہی مسائل وغیرہ میں جو اصلاحات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں (اور اس اصلاحات کی انجامدہی کو بھی ایک تحریک کا نام دیا جاسکتا ہے)۔ اسی طرح ہندوستان میں شیعہ نماز جماعت اور نماز جمعہ کا انعقاد و قیام وغیرہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہوں نے شیعہ مذہب کی صحیح شناخت اور اس کی بقاء کے لئے کتنی کوششیں کی ہوں گی۔ (اس بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے رجوع کر سکتے ہیں: تاریخ العلما

تحریک سے کم نہیں ہیں اور ان کی یہ کوشش نہ صرف ہندوستان کے شمالی علاقوں میں شیعہ قوم کی بیداری میں موثر رہی ہے بلکہ برصغیر میں موثر ثابت رہی ہے۔ البتہ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اودھ کے نوابوں نے بھی شیعیت کو فروغ دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور انہوں نے مذہبی اور دینی کاموں کو بڑھاوا دینے کے لئے انہیں علماء کا سہارا لیا اور علماء نے بھی شیعہ مذہب کے اصول و قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے نوابی حکومت کی مدد اور ان کا ساتھ دیا ہے[۱]۔

ہم یہاں پر کچھ ایسی تدریجی تحریکوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن میں خاندان اجتہاد کے علماء اور دانشمندوں کا مرکزی کردار رہا ہے بلکہ دراصل وہی لوگ اس کے محرک رہے ہیں۔ اگرچہ بیسویں صدی عیسوی میں آنے والی نئی نسلوں نے اس کو نئی شکل و جہت دیدی ہے لیکن اس کا سرچشمہ انہیں اولین محرکین کی طرف پلٹتا ہے جن کی کوششوں کے نتیجہ میں ہندوستان میں ہم کو مکمل شیعہ معاشرہ اپنے تمام اصول و قوانین کے ساتھ دستیاب ہوا ہے کیونکہ کوئی بھی معاشرہ دفعتا وجود میں نہیں آتا بلکہ کسی معاشرے کو معاشرہ بننے تک بہت وقت لگتا اور بہت سے افراد کی کوششیں اور قربانیاں بھی شامل حال ہوتی ہیں۔ بہر حال ہندوستانی شیعوں کی مذہبی اور سماجی بیداری میں کچھ ایسی تدریجی تحریکیں نظر آتی ہیں جن کی ایجاد و تشکیل میں خاندان اجتہاد کے علماء و دانشمندوں کا اہم اور مرکزی کردار رہا ہے ان میں سے بعض تحریکیں شیعہ معاشرے کی ایسی اہم رکن ہیں جن کے بغیر سماج و معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے۔

مولف محمد حسین، نظامی پریس لکھنو ۱۹۷۱ء، تذکرۃ العلماء مولف سید مہدی بن نجف علی و کتاب آئینہ حق نما اور کتاب سوانح غفرانمآب مولف سید آغا مہدی وغیرہ۔

۱۔ نوابین اودھ کا دور حکومت (۱۷۲۲ الی ۱۸۵۷ء) ہندوستان میں شیعوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کا زرین عہد رہا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں کہ: نوابان اودھ صرف شیعہ ہی نہیں تھے بلکہ اس مذہب کے سرگرم مبلغ بھی تھے چنانچہ نواب آصف الدولہ نے مذہب تشیع کی اشاعت میں دل سے کوشش کی اور ان کے نائب حسن رضا خان نے بھی اس راہ میں بہت کوششیں کیں جن کی کوشش کے نتیجہ میں ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہوگئے اور ان کو جاگیریں بھی دی گئیں۔ (رجوع کریں: قاضی اطہر مبارکپوری، دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۱۱۰)۔ خاندان اجتہاد کے بیشتر علماء اسی دور میں علمی، مذہبی اور سماجی فعالیت کرتے رہے ہیں جنہوں نے کبھی بھی حکومت یا کسی حکومتی منصب کی لالچ میں دین کا سودا نہیں کیا بلکہ حکومت کے غلط کام کو بغیر کسی ڈر اور خوف کے ٹوک دیا ہے کہ فلاں کام ہمارے مذہبی اصول کے خلاف ہے۔

ا۔ علماء وطلاب دینی کی تربیت

کسی مذہب کی تشکیل اور اس مذہب سے جڑے ہوئے معاشرے و سماج کی ترویج میں علماء کا بہت ہی اہم کردار ہوتا ہے۔ علماء جہاں دینی باتوں کو پھیلانے کے لئے اپنے زمانے میں موجود تمام ذرائع کا استعمال کرتے ہیں وہیں ان کو یہ بھی فکر ہوتی ہے کہ اپنے اس تسلسل کو برقرار رکھیں تاکہ مذہبی باتوں کو پہنچانے میں رہبریت کا خلا واقع نہ ہو لہٰذا علماء اپنی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ علماء کی تربیت کا شیوہ کبھی ترک نہیں کرتے تاکہ دینی باتیں پہنچانے کا یہ سلسلہ آنے والی نسلوں تک برقرار رہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اقدام کرنے والے مجتہد سید دلدار علی ملقب بہ غفرانمآب علیہ الرحمہ ہیں جنہوں نے شاگردوں کی پرورش وتربیت کی اور ان کا ہر ایک شاگرد نابغہ زمانہ رہا ہے۔ ان کے کچھ شاگردوں کا نام بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ سلطان العلماء اور محمد مفتی قلی جو علم کلام میں مہارت رکھتے تھے، سبحان علی خان مناظرے کی مہارت سے بخوبی واقف تھے، سید العلما علامہ علیین اور علامہ سید احمد فقہ واصول میں متبحر تھے، مولوی یاد علی نصیرآبادی علم تفسیر میں ماہر تھے، مرزا زین الدین احمد خان علوم ادب، عروض و قوافی میں مہارت رکھتے تھے اور سید نظام الدین حسین علوم معقولات اور ریاضیات میں تبحر رکھتے تھے[1]۔ خاندان اجتہاد کے علماء کی جانب سے درس وتربیت کا یہ سلسلہ نوابی حکومت میں اتنا منظّم رہا ہے کہ اودھ کے مختلف علاقے مثلاً جونپور، فیض آباد، غازیپور اور مبارکپور[2] وغیرہ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے یہی تربیت یافتہ شاگرد برصغیر کے مختلف اور دور دراز علاقوں میں شیعیت کی ترویج واشاعت کا سبب بنے ہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے لیکر انیسویں صدی کے نصف آخر تک اگر آپ ملاحظہ کریں گے تو خاندان اجتہاد کے تقریباً اٹھارہ جید علمائے کرام نظر آتے ہیں جو اپنے زمانے کے مشہور شیعہ عالم تھے اور ان میں سے پانچ غفرانمآب کے بیٹے ہیں اور بقیہ ان کے پوتے وغیرہ ہیں جنہوں نے اس مسند درس و تربیت کو برقرار رکھا اور ان کا دائرہ کار صرف لکھنو تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ پورے برصغیر میں ان کے بہت سے شاگرد، مقلدین و مبلغین پھیل چکے تھے جو ہمیشہ ان سے رابطہ میں رہ کر مذہب اہلبیت علیہم السلام کو پھیلانے کا کام کر رہے تھے۔ جیسا کہ غفرانماب، تاج العلما، علیین مکان، فردوس مآب، ملاذ العلما اور ممتاز

ا۔ سید مہدی بن نجف علی عظیم آبادی، تذکرۃ العلما، ورثۃ الانبیاء، ص ۳۱۱ الی ۳۲۵

۲۔ دیار پورب میں علم اور علما، ص ۱۱۱-۱۱۳؛ قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ شجرہ علمائے مبارکپور، ص ۳۵

العلما کے شاگردوں میں مولانا سید عبدالعلی، مولانا سید منصب علی، مولانا ملا احمد حسین، مولانا محمد ابراہیم، مولانا سید علی جواد، مولانا سید علی حسین وغیرہ غازیپور اور زنگی پور میں مصروف عمل تھے[1] اور کنتور سے مولانا اعجاز حسین، مولانا تصدق حسین، مفتی قلی خان، مولانا غلام حسنین کنتوری اور مولانا میر حامد حسین وغیرہ[2]۔ الہ آباد میں مولانا سید امجد حسین، مولانا ابوالحسن اور سید آغا صاحب[3] اور اسی طرح جائس، جونپور، بدایوں، سنڈیلہ، بلگرام، محمدآباد، بنارس، زیدپور، بارہ بنکی، میرٹھ، سلطانپور، کانپور، کوپاگنج، مبارکپور وغیرہ میں مولانا ناصر حسین جونپوری، مولانا محمد اعجاز بدایونی، مولانا اشرف علی بلگرامی، مولانا سید احمد علی محمدآبادی، مولانا سید احمد حسن شکارپوری، مولانا مرزا محمد فیض آبادی، مولانا سید علی جائسی، مولانا غلام حسین بنارسی، مولانا علی نقی شاہ سلطانپوری[4]، مولانا غنی نقی زیدپوری، مولانا افضل حسین، مولانا خواجہ عابد حسین[5]، مولانا عبدالرشید کوپاگنجی و شیخ علی سجاد مبارکپوری[6] وغیرہ۔

اس مختصر سی فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خاندان اجتہاد کے علماء نے درس و تربیت کے انداز میں جو تحریک چلائی تھی وہ کتنی کارگر ثابت رہی اور پوری ایک صدی کے اندر شاگردوں کی ایک ایسی کہکشاں وجود میں آگئی جس نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں شیعیت کی روشنی پھیلادی اور آج بھی اس کی روشنی مدرسوں کی صورت میں باقی ہے اور تشنگان علم کو فائدہ پہنچارہی ہے کیونکہ ہندوستان کے قدیم مدرسوں کے اکثر بانیوں کا شمار بھی خاندان اجتہاد کے شاگردوں ہی میں ہوتا ہے اور اسی قدیم مدرسوں سے فارغ ہونے والے طلاب نے اسی شعاع سے جدید مدرسوں کا قیام کیا ہے گویا ایک چراغ سے مختلف چراغ جلائے گئے ہیں۔

۱۔ محمد حسین نوگانوی، تذکرہ بی بہا، ج۱، ص ۳۳و۳۴، ۴۰، ۴۲، ۷۰و۷۱، ۱۲۹و۱۳۰، ۱۴۰و۱۴۱، ۱۶۱، ۲۲۱، ۲۴۴، ۳۳۷،

۲۔ ایضا، ص ۴۰و۴۱، ۱۱۸و۱۱۹، ۲۸۰، ۱۵۹

۳۔ ایضا، ص ۶۳و۶۴، ۷۹و۸۰۔ آغا مہدی لکھنوی، سوانح حیات فردوس مکان، ص ۱۴و۱۵، کراچی ۱۳۸۲ھ

۴۔ ایضا، ص ۴۰، ۸۳، ۹۳، ۴۵و۴۶، ۲۷۸، ۴۱۹، ۴۲۰۔ آغا مہدی لکھنوی، سوانح حیات فردوس مکان، ص ۴۱ الی ۴۳، سید احمد نقوی لکھنوی، ورثۃالانبیاء، ص ۵۳و۵۴، ۷۶، ۲۰۹و۲۱۰

۵۔ سید علی محمد نقوی، فقہ و فقہا در ہند، ص ۱۳۱و۱۳۲

۶۔ سعید اختر رضوی، خورشید خاور، ص ۲۲۸، ، کرار حسین اظہری، شجرہ طیبہ یعنی مبارکپوری شیعہ علمائے کرام کے حالات، ص ۵۸

۲۔مذہبی و دینی کتابوں کی تالیف و ترجمے

کسی بھی مذہب کے اصول و قوانین کو سمجھنے میں اس مذہب سے متعلق لکھی جانے والی کتابوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ کسی بھی مذہب کو تاریخی، اعتقادی، کلامی پہلو سے جانچنے اور پرکھنے کے لئے اس کے ہر پہلو سے متعلق کتابوں (جو تحقیقی میدان کا اہم جز رہا ہے) کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر زمانے میں ہر مذہب کے علما و دانشمند حضرات اپنے مذہب سے متعلق کتابیں تحریر کرتے رہتے ہیں تاکہ آنے والی نسلوں تک ان کا پیغام منتقل ہوتا رہے اور اسی طرح ان کے مذہب کے بارے میں ہونے والے اعتراضات کا جواب بھی ان کے مذہبی اصول کے مطابق دیا جاتا ہے۔

سید دلدار علی غفرانمآب وہ پہلے ہندوستانی مجتہد اور عالم دین ہیں جن کو شیخ طوسی یا وحید بہبہانی اور شیخ مرتضی انصاری سے مقایسہ کیا جاسکتا ہے[۱] کیونکہ انہوں نے ہندوستان میں نہ صرف پہلی بار حوزہ علمیہ اور درس خارج کا قیام کیا بلکہ ہندوستان میں شیعوں کی نماز جمعہ بھی قائم کی[۲] اور وہی وہ پہلے ہندوستانی مجتہد بھی ہیں جنہوں نے شیعوں کی بیداری اور شیعہ مذہب کی شناخت اور اس کے اصول و مفاہیم کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے متعدد کتابیں تحریر کی ہیں اور اسی طرح ان کے بیٹوں نے بھی اپنے والد بزرگوار کی راہ کو جاری رکھتے ہوئے کتابوں کی صورت میں بیشمار قیمتی سرمایہ ہمارے لئے چھوڑ رکھا ہے جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں کی تالیفات کو مندرجہ ذیل چند موضوعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اخباریوں کی رد میں کتابیں تحریر کی ہیں جن کا تعلق علم فقہ اور اصول فقہ سے ہے۔ ۲۔ عقاید اور فقہی احکام سے متعلق متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ ۳۔ سیرت اور واقعہ کربلا سے متعلق کتابیں۔ ۴۔ درسی اور ادبی کتابوں کی شرحیں۔ ۵۔ تصوف کی رد میں لکھی جانے والی کتابیں۔ ۶۔ اہل سنت اور بالخصوص وہابیت کی رد میں لکھی جانے والی کتابیں۔ ۷۔ علم کلام کے موضوع پر کتابیں۔

نمونہ کے طور پر خاندان اجتہاد کے علما اور ان کے شاگردوں کی بعض معرکہ آراء کتابوں کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو مذہب شیعہ کے دفاع اور اس کے اصول و مفاہیم کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں: کتاب عماد الاسلام، ذوالفقار، صوارم الالہیات و حسام الاسلام (رد تحفہ اثناعشریہ) غفرانمآب کی ان علمی کتابوں میں سے

۱۔ سید علی محمد نقوی، فقہ و فقہا در ہند، ص۵۶

۲۔ سید آغا مہدی لکھنوی، سوانح غفرانمآب، ص۱۶و۱۷

ہیں اور جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی[۱]۔ اسی طرح سلطان العلماء سید محمد ابن دلدار علی کی کتابیں ضربت حیدریہ و طعن الرماح و برق خاطف (در مبحث فدک) بوارق موبقہ و رد تحفہ اثناعشریہ (در مبحث خلافت و امامت) بارقہ ضیغمہ (متعہ کے بارے میں) ازالۃ الغی در رد اندیشہ عبدالحیی، صمصام قاطع شعائر عزاداری اور سید العلما سید حسین ابن دلدار علی کی کتابیں حدیقۂ سلطانیہ (۵ جلد اصول دین شیعہ کے بارے میں) وسیلہ النجاۃ اور تاج العلما سید علی محمد کی کتابیں صولت العلویہ (در رد نصاری)، مہدویہ (در رد مہدی سودانی)، رحیق مختوم (در بارہ واقعہ غدیر)، اثناعشریہ فی بشائر النبویہ وغیرہ۔

اسی طرح ان لوگوں کے بعض شاگردوں کی مشہور کتابوں میں کتاب تشئید المطاعن از مفتی محمد قلی؛ کتاب سیف مسلول، دلیل قوی، روائح القرآن، جواہر عبقریہ (در رد تحفہ اثناعشریہ)، شعلہ جوالہ در اثبات احراق مصحف توسط خلیفہ عثمان از مفتی محمد عباس[۲] و کتاب استقصاء الافہام فی رد منتہی الکلام اور عبقات الانوار از میر حامد حسین اور کتاب النار الحاطمہ لقاصد احراق بیت فاطمہ از غلام حسنین کنتوری؛ کتاب سیف اللہ الاکبر علی مفرق ذی الضرب المنکر ملقب بہ ذوالفقار حیدر، کنز مکتوم فی حل عقد ام کلثوم، تشفی اہل السنہ والخوارج، دفع الوثوق عن نکاح الفاروق، المرافعات (در رد شاہ عبدالعزیز) از سید علی اظہر وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے[۳]۔ اس کے علاوہ بھی شیعہ فقہ و اصول، تاریخ و سیرت، تفسیر و علم کلام کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا یہاں تذکرہ کرنا ضروری نہیں ہے[۴]۔

نوابی حکومت کے زوال کے بعد معاشرے نے جہاں سیاسی اور سماجی کروٹ لی وہیں رفتہ رفتہ فارسی اور عربی زبان پر بھی اس کے اثرات مرتب ہونے لگے کیونکہ انگریزوں نے انگریزی زبان کو اداروں میں

۱۔ سید احمد نقوی، ورثۃ الانبیاء، ص۵۱-۵۲؛ سید علی نقی النقوی، مذہب شیعہ اور تبلیغ، ص۲۵-۲۶

۲۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، تجلیات یعنی تاریخ عباس، ص۱۹۹؛ مفتی محمد عباس، الشعلۃ الجوالہ، ص۱

۳۔ سید احمد نقوی، ورثۃ الانبیاء، ص۷۴-۷۵، ۲۰۲، ۳۳۴-۳۳۶، ۳۷۶-۳۷۷، ۴۲۸-۴۳۰؛ سید آغا مہدی، تاریخ سلطان العلما، ص۱۵۲-۱۵۴، کراچی ۱۳۸۲ھ؛ محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، ص۴۵-۵۱؛ علی نقی النقوی، مذہب شیعہ اور تبلیغ، ص۲۵-۲۶؛ غلام حسنین کنتوری، النار الحاطمہ؛ علی اظہر؛ مرتضی حسین، مطلع انوار، ص۳۴۷

۴۔ اس بارے میں بیشتر آگاہی کے لئے کتاب ورثۃ الانبیاء، سید اطہر عباس رضوی (A Socio-Intellectual History of the Isna Ashari Shia in India,) و کتاب مطلع انوار مولف مرتضی حسین کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

رائج کر دیا البتہ مسلمانوں کے یہاں ان زبانوں کا علمی درجہ برقرار تھا اور مسلمانوں کے بہت سے علماء اپنی تالیفات ابھی بھی عربی اور فارسی زبان میں ہی لکھتے تھے[1] لیکن عوام سے افہام و تفہیم کے لئے اردو زبان کو وسیلہ قرار دیا جانے لگا کیونکہ ۱۸۸۰ء سے لیکر ۱۹۰۰ء کے دوران چاپخانوں اور پریس کی ایجاد سبب بنی کہ اردو زبان میں بہت سے اخبار اور مجلات شائع ہونے لگے اور عوام نے بھی اس کی طرف بھرپور دلچسپی دکھائی، گویا اخبارات اور مجلات اس زمانے کے بہترین ذرائع ابلاغ تھے جو میڈیا کا کام کرتے تھے لہٰذا وہ علماء جو ابھی تک اپنی تالیفات عربی اور فارسی میں لکھتے تھے وہ بھی اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ اگر ہمیں اپنی بات عوام تک پہنچانا ہے تو ہمیں وقت کے تقاضے اور زبان کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی بات پہنچانی ہوگی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہمیں جہاں عربی و فارسی تالیفات کی اشاعت میں کمی نظر آتی ہے وہیں دینی اور درسی متون سے متعلق کتابوں کے اردو تراجم اور اردو زبان میں تالیفات کی بہتات بھی نظر آتی ہے۔ اس موقع کی نزاکت اور وقت کی کروٹ کو بھی سب سے زیادہ خاندان اجتہاد کے علما و دانشمندوں اور ان کے شاگردوں نے ہی محسوس کیا اور اس تحریک میں انہیں کا بیشتر حصہ رہا ہے۔

نمونہ کے طور پر بعض کتابوں کو پیش کرتے ہیں جس کی بیشتر اشاعت ۱۸۵۰ء سے لیکر بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوئی ہیں: مولانا سید علی محمد نے قرآن مجید کا پہلی بار اردو میں ترجمہ کیا[2] اور اسی طرح صحیفہ کاملہ، احقاق الحق، کتاب شرح باب حادی عشر و کتاب جامع الاحکام، محیط الدائر (در علم عروض)، در ثمین محسن عملی (در عقائد)، کتاب قانون ابو علی سینا، ترجمہ و تفسیر قرآن (توسط مولوی فرمان علی)، ترجمہ

۱۔ چنانکہ سید احمد علی محمد آبادی، ابوالحسن ابو صاحب، ملاذ العلماء ابوالحسن ابن بندہ حسین، مفتی محمد عباس، ابوالحسن رضوی، سید نجم الحسن، غلام حسنین کنتوری، ممتاز العلما سید محمد تقی و تاج العلما، علامہ احمد ہندی، ناصر حسین ابن میر حامد حسین، عمادالعلماء محمد مصطفیٰ، بحر العلوم محمد حسین علن، فخر العلماء سید علی اظہر، شیخ فدا حسین، محمد محسن زنگی پوری کا شمار ان علما میں کیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء تک جن کی اکثر تالیفات عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں۔ (ان علما کی تالیفات کی بارے میں بیشتر معلومات کے لئے کتاب ورثۃ الانبیاء، کتاب نجوم السماء مولف محمد مہدی کشمیری، تذکرہ بی بہا مولف محمد حسین نوگانوی اور کتاب مطلع انوار کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ آغا مہدی لکھنوی، تاریخ سلطان العلما، ص ۱۷۵؛ مذہب شیعہ اور تبلیغ، ص ۲۷

ناسخ التواریخ، اصول کافی، اعتقادیہ صدوق، ارشاد المفید، منار الہدی، فصول المہمہ بن صباغ، احتجاج طبرسی، خلاصہ عباسی، خصال صدوق، معالم الاصول، زبدۃ الاصول، نہج البلاغہ، وجیزۃ درایہ، مصباح المنطقیہ، رسالہ سقراط، حکمہ الاشراق وحلیۃ المتقین وغیرہ کتابوں کو اس زمانے کے شیعہ علماء کے ذریعہ اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اس کی اشاعت عمل میں آتی رہی[۱]۔

ان تراجم کے علاوہ علماء اس بات کی طرف بھی متوجہ ہوئے کہ دینی اور مذہبی کتابوں کی اشاعت یا ترجمہ شدہ کتابوں کی اشاعت کے لئے ایسے مراکز کا قیام کیا جائے[۲] جہاں سے مستقل شیعہ کتابوں کی اشاعت ہوتی رہے لہٰذا سب سے پہلے قدوۃ العلماء آقا سید حسن نقوی نے وقت کی تبدیلیوں کے پیش نظر بیسویں صدی کی پہلی ہی دہائی میں ''دارالترجمہ'' کی بنیاد رکھی[۳] جس کا اہم مقصد یہ تھا کہ گذشتہ علماء کی کتابوں کا موجودہ زمانے کی عام فہم زبان میں ترجمہ کیا جائے لہٰذا بہت سی کتابیں اس موسسہ سے شائع ہوئیں اور اسی طرح قدوۃ العلماء سید آقا حسن اور علامہ ہندی جناب سید احمد کے ذریعہ سنہ ۱۹۱۰ء میں ''انجمن یادگار علماء'' کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد بھی گذشتہ اور متاخرین علما کے آثار وتالیفات کا احیاء تھا[۴]۔ اسی طرح

۱۔ مرتضی حسین، مطلع انوار، ص۱۳۸، ۳۸۷-۳۸۸، ۴۰۶، ۴۸۶-۴۸۷، ۵۰۷، ۵۲۷، ۶۲۶-۶۲۷، ۶۲۹، ۶۴۴۔

۲۔ البتہ ایسا نہیں ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء قبل شیعہ کتابوں کی نشر واشاعت کا کوئی مرکز نہیں تھا بلکہ تاریخ اور کتابوں کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں کی کتابیں اکثر مطبع مصطفائی، مطبع سلطانی، مطبع علوی، مطبع نولکشور، مطبع اثناعشری اور مطبع جعفری وغیرہ سے شائع ہوتی تھیں لیکن ان چاپخانوں سے شیعہ کتابوں کے علاوہ دیگر موضوعات اور مذاہب کی کتابیں بھی شائع ہوتی تھیں اور یہ چاپخانے شخصی و ذاتی ہوا کرتے تھے اور بقول عبدالحلیم شرر: وہ چاپخانے جن کا قیام نوابی حکومت میں یا اس کے کچھ سالوں بعد ہوا تھا وہ بیشتر ادبی شوق کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے جو رفتہ رفتہ تجارتی صورت اختیار کر گئے تھے۔ (عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، ص۱۲۳، لکھنو ۱۹۲۰ء)۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقط شیعہ مذہب کے اصول اور نظریات کی نشر واشاعت کا کوئی خاص مرکز نہیں تھا۔

۳۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انجمن صدر الصدور کے قیام کے بعد ہی ''دارالترجمہ'' کا قیام عمل میں آیا۔ (آقا حسن، ترجمہ عمادالاسلام، حصہ اول: کتاب التوحید، ص۲-۳، لکھنو ۱۹۰۵ء اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس اول، ص۱۱۷، لکھنو ۱۹۰۸ء۔

۴۔ اخبار شیعہ اثناعشری، ص۱۰، جلد۶، شمارہ۱۵، ۱۵اپریل ۱۹۱۰ء دہلی؛ اخبار شیعہ اثناعشری، ص۱۰-۱۱، جلد۶، شمارہ۳۰، ۸اگست ۱۹۱۰ء۔ جناب مرتضی حسین لکھتے ہیں کہ علامہ ہندی نے تیس سال تک اس انجمن میں خدمات انجام دی ہیں۔ (مرتضی حسین، مطلع انوار، ص۷۲)

آگے چل کر ''انجمن مؤید العلوم[1] ''اور سنہ ۱۹۳۲ء میں جناب ابن حسین نقوی اور علامہ سید علی نقی نقوی نے ''امامیہ مشن'' کا قیام کیا[2] جس کے ذریعہ مسلسل مختلف موضوعات پر بیشمار شیعہ کتابیں اردو زبان میں منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

۳۔ کتب خانوں کا قیام

ہر دور میں علم دوست افراد پائے جاتے رہے ہیں جنہوں نے کتابوں کے مطالعہ سے دلچسپی کے باعث کتابیں جمع کی جو بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے ذخیرہ قرار پائی ہیں۔ انہیں علم دوست افراد میں اودھ کے نوابوں کا بھی شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنی حکومت کے دوران کتب خانوں کا قیام کیا جن کی ایک مثال امیر الدولہ لائبریری لکھنو ہے جن سے لوگ آج بھی مستفید ہو رہے ہیں اگرچہ نوابی حکومت کے بیشتر کتب خانے اور اس کی کتابیں پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷) کے وقت برباد ہو گئی تھیں۔ان کے علاوہ، اس تحریک میں وہ علم دوست علماء بھی شامل تھے جنہوں نے مذہب شیعہ کے مواد و متون کی بقاء کے لئے کتب خانوں کا قیام کیا تھا جو آج شیعی سماج کا بہت بڑا علمی ذخیرہ ہے اگرچہ یہ کتب خانے ابتدا میں شخصی گھروں میں پروان چڑھے لیکن مرور ایام کے ساتھ وہ عام لوگوں کے استفادہ کے لئے قرار دیئے گئے۔ اگر علماء کتب خانوں کی صورت میں کتابوں کی ذخیرہ اندوزی کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یقین جانیے آج ہم شیعی مفاہیم اور ثقافت کی آگاہی سے دور رہتے۔ بہر حال اس میدان میں شیعہ علماء نے اپنی دور اندیشی کا ثبوت دیا اور اس ثقافت سازی میں بھی خاندان اجتہاد کے علماء اور ان شاگردوں کا مرکزی کردار رہا ہے۔

سید دلدار علی غفرانمآب نے اپنے زمانے میں ایک کتب خانہ قائم کیا جو بعد میں ان کے بیٹوں کی سرپرستی میں تھا اور ''کتب خانہ خاندان اجتہاد'' کے نام سے مشہور ہوا[3]۔ سید نقی کا کتب خانہ جو ''کتب خانہ

۱۔ ''انجمن مؤید الاسلام'' کتابوں کی نشر و اشاعت کا ایسا مرکز تھا جس کی بنیاد مدرسۃ الواعظین کے قیام کے بعد مولانا سید نجم الحسن اور دیگر علماء کی کوششوں رکھی گئی تھی۔

۲۔ سعید اختر رضوی، خورشید خاور، ص ۲۶۵

۳۔ محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، ص ۱۲۳

زبدۃ العلماء" کے نام سے معروف ہوا[۱]۔ سید تقی یعنی "کتب خانہ ممتاز العلماء[۲]" جو غالباً آج بھی موجود ہے۔ سید محمد قلی کا کتب خانہ یعنی "کتب خانہ ناصریہ"[۳]، "کتب خانہ دارالذکر"[۴]، کتب خانہ سید علی نقی نقوی ہندوستان کی اسلامی اور شیعی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کتب خانوں کے علاوہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں بہت سے دیگر کتب خانے قائم ہوئے جن میں مشہور کتب خانہ عماد العلماء، کتب خانہ مدرسہ ناظمیہ، کتب خانہ سلطانیہ، کتب خانہ مدرسۃ الواعظین[۵] اور کتب خانہ راجہ محمود آباد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ محمد باقر شمس کے بقول کتابخانہ زبدہ العلما اور اسی کتابخانہ سید دلدار علی کی بیشتر کتابیں مفقود ہو چکی ہیں (محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، ص ۱۲۴)۔

۲۔ محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، ص ۱۲۳-۱۲۴؛ مولانا سید آغا مہدی کتب خانہ ممتاز العلماء کے متعلق لکھتے ہیں کہ: اس کتابخانہ میں فقہ اور تفسیر کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ ہے جو عراق و حجاز میں بھی نہیں ہے اور مصنفین کے اصل مخطوطات، سلاطین دنیا کے کتب خانوں کی خاص کتابیں ہیں۔ سونا چڑھے ہوئے مختلف الالوان چوتھی صدی کے قدیم نوشتے اور کمیاب کتابوں میں تفسیر ثعلبی کا خرمہ کی روشنائی سے لکھا ہوا قدیم نسخہ جس کی قیمت سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک لاکھ روپیہ تجویز کی گئی تھی اور شہید اول علیہ الرحمہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا صحیفہ کاملہ اور تفسیر منبع عیون معانی اور فقہ رضوی نسخہ امام سے مطابق بکثرت کتابیں قابل ذکر ہیں۔ اور اس لائبریری میں وہ کتاب بھی موجود ہے جو عراق سے روانگی کے وقت سمندر میں گر گئی تھی اور ساحل بمبئی میں شکم ماہی سے برآمد ہوئی تھی۔ مکتبہ ممتاز العلما اور ضمیمہ کتب خانہ میں ۴۲۴۱ کتب موجود ہیں۔ (سید آغا مہدی، تاریخ شیعہ کا خونچکاں ورق، ص ۸۹، مطبوعہ الواعظ صفدر پریس لکھنو ۱۳۷۶ھ)۔

۳۔ جناب صابر رضوی اس کتب خانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: علامہ مفتی محمد قلی نے جو کتب خانہ قائم کیا تھا اس کو آپ کے نور نظر نے جو غیر معمولی زحمتیں برداشت کر کے وسعت دی اور کتابوں کی تعداد کو دس ہزار تک پہنچایا وہ حیرت انگیز تھا لیکن سرکار ناصر الملت نے جو ترقی دی اس کو معراج ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتب خانہ میں بعض وہ نادر نسخے موجود ہیں جو دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں پائے جاتے یہی وجہ ہے کہ یہ کتب خانہ دنیائے اسلام میں کافی مشہور ہے۔ (صابر رضوی، حافظ علی، نیرین، ص ۵۱، نشر ادارہ تحفظ حسینیت، لکھنو ۱۹۶۲ء)۔

۴۔ اخبار شیعہ اثنا عشری، ص ۹، جلد ۴، شمارہ ۱۲، ۲۳ جولائی ۱۹۰۷ء۔

۵۔ محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، ص ۱۲۴-۱۲۶۔

۴۔ مذہبی وسماجی تنظیموں کا قیام

مذہبی اور دینی انجمنوں یا سماجی تنظیموں کا قیام اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ متعلقہ مذہب اور سماج کے لوگوں نے اپنے سماج کی ترقی اور مضبوطی کے لئے ایک منظّم قدم اٹھایا ہے جس کے ذریعہ سماج کے حالات کو متحد ہو کر تنظیم اور کمیٹی کی صورت میں سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس باہمی اتحاد و اتفاق کا نتیجہ بھی بہت جلد کامیابی کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ ہندوستان میں شیعوں کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جہاں وقت کی سماجی و سیاسی کروٹوں کو محسوس کرتے ہوئے عیسائیوں اور مسلمانوں نے انجمنوں اور تنظیموں کا قیام کرکے اپنے فرقے اور مذہب کو ترقی کی راہ میں ہمہ جہت منظّم کرنے کی کوشش کی ہے وہیں شیعہ بھی اس معاملہ میں کسی سے کم نظر نہیں آتے اور انہوں نے بھی مذہبی، سماجی، اقتصادی اور علمی ترقی کی راہ کو مد نظر رکھتے ہوئے تنظیموں اور انجمنوں کا قیام کیا ہے اور اپنی قوم کو ہمہ جہت ترقی کی راہ میں منظّم کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیعوں کی اس بیداری کی راہ میں بھی خاندان اجتہاد اور ان کے شاگردوں کا مرکزی اور محوری کردار رہاہے۔ چنانچہ شیعوں کی سب سے بڑی اور تاثیر گذار تنظیم "انجمن صدرالصدور یا امامیہ کانفرنس"[۱] سنہ ۱۹۰۱ء میں قدوۃالعلماء سید آقا حسن نقوی کی سرپرستی میں قائم ہوئی[۲]۔ اور سنہ ۱۹۰۷ء میں اس کا نام بدل کر "آل انڈیا شیعہ کانفرنس" کردیا گیا۔ اس کا اہم مقصد شیعہ قوم کو سماجی، اقتصادی اور علمی پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ میں مضبوط کرنا تھا۔ اگرچہ ۱۹۰۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۰۷ء تک کچھ باتوں کو لیکر علماء میں

۱۔ اس زمانے میں انجمن صدرالصدور کو امامیہ کانفرنس بھی کہا جاتا تھا لیکن ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ء کو اس کا نام بدل کر آل انڈیا شیعہ کانفرنس رکھا گیا۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس کانفرنس کے نام کے بارے میں لوگوں کی متعدد رائے تھی بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کا نام امامیہ کانفرنس ہی رہے لیکن اکثر لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ ایسا نام رکھا جائے تاکہ اسماعیلی اور بوہرہ شیعہ بلکہ ہندوستان میں موجود تمام شیعی فرقہ بھی اس میں شامل ہوسکے۔ (اخبار شیعہ اثناعشری، ص۶، جلد۳، شمارہ۲۵، یکم نومبر ۱۹۰۷ء)

۲۔ وکیل، آغا حیدر، شیعہ قومی جلسے، اخبار شیعہ اثناعشری، ص۱۰، ۵، جلد۳، شمارہ۲، ۸ مئی ۱۹۰۷، علی نقی صفی لکھنوی،، صحیفۃ صحیفۃالملت معروف بہ لخت جاگیر، ص۶-۷، لکھنو؛ ممتاز حسین جونپوری، ہندوستان میں شیعوں کی مجمل تاریخ اور بنای شیعہ کانفرنس، ص۷-۸

اختلاف نظر تھا یہاں تک کہ سید محمد حسین ابن ملک العلماء سید بندہ حسین اور سید آقا حسن کو کانفرنس کی سماجی اور علمی کارکردگی اور اس کی ضرورت کے متعلق فتوا بھی دینا پڑا[1]۔ ہم یہاں پر ان اختلافی مسائل کے بیان سے گریز کرتے ہوئے اس کانفرنس کی مذہبی اور سماجی خدمات پر مختصر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جس سے ان بزرگ علماء کی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ سے باقاعدہ طور پر اس کانفرنس کا آغاز ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے بلائے گئے تقریبا ۴۵۰ علما و دانشمندان اور نواب و راجہ کے باہمی اتفاق و اتحاد سے ہوا[2] جس کے پہلے صدر قدوۃ العلما سید آقا حسن قرار پائے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۱ سے لیکر ۱۹۱۰ تک کانفرنس کی جانب سے یہ بھی جاننے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں شیعوں کی علمی، اقتصادی، سماجی حالات کیسے ہیں اور کس علاقہ میں کتنے شیعہ رہتے ہیں؟ لہٰذا اس کام کی انجامدہی کے لئے کانفرنس کی جانب سے مختلف علاقوں مثلا بارا بنکی، جونپور، غازیپور، کانپور، بنارس، رائے بریلی، حضرت پور، رسولپور، کنتور، جرول، سنڈیلہ، بلگرام میں نمائندے بھیجے گئے[3]۔ ان نمائندوں کا کام شیعوں کے حالات سے متعلق رپورٹ تیار کرنا اور وہاں کے حالات کو سدھارنے کے لئے اسی علاقے میں ایک انجمن بنانا جو کانفرنس سے رابطہ میں رہ کر علاقے کے لئے فلاح و بہبود کا کام کرتی رہے اور انجمن کے موجود ہونے کی صورت میں اس انجمن کو کانفرنس سے جوڑنا اور ذمہ داری دینا تھا، جس کے نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کانفرنس کی کارکردگی کا

۱۔ ان فتووں کی نقل اس زمانے کے مشہور و معروف شیعہ اخباروں اور مجلّوں میں شائع ہوئے تھے۔ (رجوع کریں: کانفرنس کے متعلق استفتاء، اخبار شیعہ اثنا عشری، ص۶-۸، جلد ۲، شمارہ ۸۴، ۲۳ اپریل ۱۹۰۷ء)

۲۔ شیعہ کانفرنس، مجلّہ اصلاح، ص۲۹-۳۱، جلد ۱۰، شمارہ ۱۷، ماہ رمضان، ۱۳۲۵ھ؛ شیعہ کانفرنس پر عصر جدید کی تہمت، مجلّہ اصلاح، ص ۳۳، جلد ۱۰، شمارہ ۲۳-۲۴، ماہ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷؛ ماہنامہ عصر جدید، ماہ اکتوبر ۱۹۰۷ لکھنو۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس کے انتظام کی پوری ذمہ داری لکھنو کی مختلف ماتمی انجمنوں مثلا مہدیہ، انجمن علویہ، انجمن قمر بنی ہاشم، انجمن پنجتنی، انجمن رفیق الایمان، انجمن عباسیہ، انجمن حسینیہ، انجمن معراج الطالبین وغیرہ نے لے رکھی تھی (اخبار شیعہ اثنا عشری، ص۱۱-۱۲، جلد ۳، شمارہ ۲۱، یکم اکتوبر ۱۹۰۷)

۳۔ اخبار شیعہ اثنا عشری، ص۱۰-۱۳، جلد ۴، شمارہ ۲۰، یکم اکتوبر ۱۹۰۸م؛ اخبار شیعہ اثنا عشری، ص۸، جلد ۴، شمارہ ۲۲، ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۸؛ اخبار شیعہ اثنا عشری، ص۵، جلد ۴، شمارہ ۲۶، ۸ نومبر ۱۹۰۸؛ اخبار شیعہ اثنا عشری، ص۱۱، جلد ۶، شمارہ ۳۸، ۸ اکتوبر ۱۹۱۰

دائرہ بہت وسیع ہوتا چلا گیا اور بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی کے آخر تک مندرجہ ذیل انجمنوں سے رابطہ برقرار کرنے کی کوشش کی گئی: انجمن جعفریہ بارہا، انجمن ناصر الایمان وانجمن سادات امروہہ، انجمن امامیہ مچھلی شہر، انجمن امامیہ سوسائٹی بریلی، انجمن ناصریہ بجنور، انجمن رفاہ الاسلام دادونپور، انجمن شیعہ بدایوں، انجمن امامیہ شاہ گنج آگرہ، انجمن مہدیہ غازیپور، انجمن سرائے میر اعظم گڑھ، شیعہ ینگ من ایسوسی ایشن ردولی، انجمن اصلاح اثناعشری میرٹھ، انجمن حسینیہ الہ آباد، انجمن کاظمیہ جرول، انجمن اثنا عشریہ ہردوئی، انجمن مرتضویہ امرتسر، انجمن محمدی مٹیابرج، انجمن حفاظت اوقاف بنگال، انجمن شیعۃ الصفا سونی پت، انجمن موئید شیعہ کانفرنس حیدرآباد وغیرہ[1]۔

اس کے علاوہ کانفرنس کے اہم کاموں میں سنہ ۱۹۱۲ء کو لکھنو میں شیعہ یتیم خانے کی تاسیس، سنہ ۱۹۱۳ میں شیعہ بورڈنگ ہاوس کا قیام اور سنہ ۱۹۱۶ء میں شیعہ بیوہ عورتوں کے لئے گھر کا قیام سید آقا حسن کی کوششوں سے ہی عمل میں آیا[2]۔ اور اسی طرح وظائف فنڈ، سنہ ۱۹۱۷ کو شیعہ کالج لکھنو کا قیام اور سنہ ۱۹۲۵ میں سرفراز پریس اور مجلّہ سرفراز کی تاسیس اور شیعہ وقف کے تحفظ کے لئے ایک کمیٹی کا قیام بھی انہیں کی سرپرستی اور کانفرنس کے زیر نگرانی انجام دیا گیا[3]۔ جناب مولانا کلب عابد کے بقول اگرچہ مدرسۃ الواعظین،

---

۱. وکیل، آغا حیدر، شیعہ قومی جلسے، روزنامہ اخبار شیعہ اثناعشری، ص۱۰، ۵، جلد ۳، شمارہ ۲، ۸ مہ ۱۹۰۷؛ انجمنھائے شیعہ اور مدارس کو علمائے شیعہ لکھنو کا پیام، اخبار شیعہ اثناعشری، ص۷، جلد ۳، شمارہ ۳، ۱۵ مہ ۱۹۰۷م؛ آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس چہارم، ص ۳۳-۳۶، ۴۱-۴۲، ۹۱-۹۲، ۱۹۱۰م؛ آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس چھٹاں، ص۷۱، ۱۴۳، ۱۵۷، ۱۹۱۲؛ . آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس ہشتم، ص۴۱، ۴۷، ۵۱، ۱۰۸، ۱۶۷، ۱۹۱۴م؛ اخبار شیعہ اثناعشری، ص۶-۷، جلد ۳، شمارہ ۹، ۸ جولائی ۱۹۰۷ و ص۹، جلد ۳، شمارہ ۱۰، ۱۵ جولائی ۱۹۰۷؛ اخبار شیعہ اثناعشری، ص۵، جلد ۴، شمارہ ۲۶، ۸ نومبر ۱۹۰۸؛ جونپوری، ممتاز حسین، ہندوستان میں شیعوں کی مجمل تاریخ اور بنای شیعہ کانفرنس، ص۱۹

۲۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس چھٹاں، ص ۲۳-۶۸، ۱۹۱۲؛ ممتاز حسین جونپوری، ہندوستان میں شیعوں کی مجمل تاریخ اور بنای شیعہ کانفرنس، ص۴۰

۳۔ مجلّہ سرفراز، ص۱۱، ۹-۱۲، ج۳۹، شمارہ ۲۰ تا ۲۲، ۲ دسمبر ۱۹۶۱ لکھنو۔ اس کے علاوہ علاوہ شیعہ دائر کٹری، شیعہ بینک، شیعہ مردم شماری، شیعہ یتیم خانہ برای نسواں بھی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی دستورات میں شامل تھے مگر ان کاموں کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ (رجوع کریں: ممتاز حسین جونپوری، لخت جگر نتیجۂ فکر صفی لکھنوی، ص ۲۸-۳۱، نظامی پریس لکھنو ۱۹۳۴ء؛ ممتاز حسین جونپوری، ہندوستان میں شیعوں کی مجمل تاریخ اور بنای شیعہ کانفرنس، ص ۲۳۲)

انجمن وظیفہ سادات اور امامیہ مشن ایک مستقل ادارے ہیں لیکن یہ بھی اسی کانفرنس کی ہی شاخ تھے[۱]۔ ان تمام تنظیموں اور موسسہ کی کارکردگی اور تفصیلات بیان کرنے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے جسے اس مختصر سے مضمون میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ہم صرف شیعہ یتیم خانے کے بعض شعبہ جات کی طرف اشارہ کردیتے ہیں کہ اس یتیم خانے کی تاسیس کے بعد اس میں صنعت و حرفت اور سلائی و کڑھائی کے شعبے بھی اس غرض سے کھولے گئے تاکہ یتیم بچہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی زندگی بہتر طریقے سے گذار سکیں[۲]۔ اس کے علاوہ کانفرنس اور شیعہ مدارس کی امداد کے لئے اور شیعہ عوام کے روزگار کے لئے لکھنو میں شکر کی فیکٹری بھی کھولی گئی تھی[۳] البتہ شکر فیکٹری کا یہ کام دیرپا نہیں رہا۔

مذکورہ تمام اطلاعات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کی مذہبی، سماجی، اقتصادی اور علمی بیداری کے لئے ان علماء و دانشمندوں نے کتنی کوششیں کی ہیں۔

نتیجہ

ہم نے اس مختصر سے مضمون میں فقط چار مذہبی و سماجی بیداری اور اس کے تدریجی مراحل کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے جن میں خاندان اجتہاد کا اہم رول رہا ہے۔ ہندوستان کے شیعوں کی تاریخ میں خاندان اجتہاد کے علماء و دانشمندوں کا اتنا اہم کردار رہا ہے جن کے تذکرے کے بغیر شیعوں کی تاریخ نامکمل ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے لیکر آج تک شیعہ سماج و معاشرے کی بیداری اور ترقی و تکامل میں براہ راست یا بالواسطہ، خاندان اجتہاد کا انتہائی اہم حصہ رہا ہے۔ چاہے درس و تربیت کی مسند ہو، شیعہ اصول سے متعلق لکھی جانے والی کتابیں ہوں، مخالفین کو کتابوں کی صورت میں جواب دینے کے مراحل ہوں، کتب خانوں کا قیام ہو، ابتدائی شیعہ مدارس کی تاسیس ہو، یتیم خانے اور کالجوں کا قیام ہو، آل

۱۔ خطبہ استقبالیہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس، مجلّہ سرفراز (خصوصی شمارہ کانفرنس)، ص۲۹، جلد۴۲، شمارہ۳، ۹ جون ۱۹۶۴ء لکھنو۔

۲۔ غلام حسنین نقوی، رپورت آل انڈیا شیعہ یتیم خانہ، مجلّہ سرفراز، ص۴۵-۴۷، جلد۳۹، شمارہ ۲۰تا۲۲، ۱۹۶۱؛ نواب حیدر علی خان، رپورت آل انڈیا شیعہ یتیم خانہ، مجلّہ سرفراز، ص۵۵-۵۶، جلد۴۷، شمارہ ۳۵و۳۶، ۲۵ دسامبر ۱۹۶۹؛ ممتاز حسین جونپوری، ص۱۶۶-۱۶۷

۳. آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس چہارم، ص۱۰۳-۱۱۴، ۱۹۱۰؛ مجلّہ اصلاح، ص۵۱، جلد۱۲، شمارہ۶؛ مجلّہ اصلاح، ص۵۶-۵۷، جلد۱۲، شمارہ۱۰؛ مجلّہ الواعظ، ص۶۲-۶۳، جلد۱۲، شمارہ۱، ماہ محرم ۱۳۲۷ھ لکھنو

انڈیا شیعہ کانفرنس جیسی مشہور تنظیم کی تاسیس ہو، شیعہ اوقاف سے متعلق بیداری اور اس کی غارتگری کے خلاف احتجاج ہو، غرض شیعہ معاشرے کی سماجی، مذہبی، علمی اور اقتصادی بیداری اور ترقی کے اکثر و بیشتر کاموں میں خاندان اجتہاد اور ان کے شاگردوں کا مرکزی کردار رہا ہے جسے رہتی دنیا تک مٹایا اور بھلایا نہیں جاسکتا۔

☆☆☆

منابع و مآخذ

- اخبار شیعہ اثناعشری، جلد۶، شمارہ۱۵، ۱۵اپریل ۱۹۱۰ء دہلی
- اخبار شیعہ اثناعشری، ص۱۰-۱۱، جلد۶، شمارہ۳۰، ۸اگست ۱۹۱۰ء
- اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس، روداد اجلاس اول، ص۱۱۷، لکھنو۱۹۰۸ء
- آغا مہدی لکھنوی، سوانح حیات فردوس مکان،
- آقا حسن، ترجمہ عمادالاسلام، حصہ اول: کتاب التوحید، لکھنو۱۹۰۵ء
- سعید اختر رضوی، خورشید خاور، معارف پبلیکشنز گوپالپور، ۲۰۰۲ء
- سید احمد نقوی لکھنوی، ورثۃالانبیاء، تصحیح علی فاضلی، نشر موسسہ کتابشناسی شیعہ، قم۱۳۸۹ش
- سید احمد نقوی، ورثۃالانبیاء
- سید آغا مہدی لکھنوی، سوانح غفرانمآب، جمعیت خدام عزا، کراچی ۱۹۷۶ء
- سید آغا مہدی، تاریخ سلطان العلما، کراچی ۱۳۸۲ھ
- سید علی محمد نقوی، فقہ وفقہا در ہند، نشر فرہنگی وہنری وانتشارات بین المللی الہدی، دہلی نو، ۲۰۱۵ء
- سید مہدی بن نجف علی عظیم آبادی، تذکرۃالعلما، ورثۃالانبیاء
- سید علی نقی النقوی، مذہب شیعہ اور تبلیغ، امامیہ مشن، لکھنو، ۱۳۵۷ھ
- غلام حسنین کنتوری، النار الحاطمہ، نشر مطبع المومنین لویانہ ۱۲۸۱ھ؛ علیاظہر، ذوالفقار حیدر، نشر مطبع اثناعشری، ۱۳۱۲ھ ، لکھنو
- قاضی اطہر مبارکپوری، دیار پورب میں علم اور علماء، نشر ندوہ المصنّفین دہلی، ۱۹۷۹ء

- قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ شجرہ علمائے مبارکپور، نشر دائرہ ملیہ مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، ۱۹۷۴ء
- کرار حسین اظہری، شجرہ طیبہ یعنی مبارکپوری شیعہ علمائے کرام کے حالات، انصار المہدی فاونڈیشن مبارکپور اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء
- محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب
- محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، باب الاسلام پریس کراچی، ۱۹۶۵ء
- محمد حسین نوگانوی، تذکرہ بی بہا، ج ا، خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو، ۲۰۱۰ء
- مرتضی حسین، مطلع انوار، خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی ۱۹۸۱ء
- مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، تجلیات یعنی تاریخ عباسنظامی پریس لکھنو ۱۹۲۵ء
- مفتی محمد عباس، الشعلۃ الجوالہ، نشر المعیار، رستم نگر لکھنو

میر انیس کی مرثیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

مؤلف: ڈاکٹر محمد جعفر

اردو کے عظیم شاعروں کے جگمگاتے کارواں میں میر ببر علی انیسؔ کا شمار صفِ اوّل کے قد آور فنکاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی بزرگی کا دار و مدار فقط اس بات پر نہیں ہے کہ انہوں نے مرثیہ جیسی صنف کو اختیار کیا جسے عام طور سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور پھر انہوں نے اسے قابلِ اعتنا بنا دیا بلکہ مرثیہ گویوں کے طبقے میں بھی انہیں ہم عصروں پر اس لئے سبقت حاصل ہوئی کہ انہوں نے تجزیہ و انحراف کے ایسے نئے اور فعال رجحان کی ابتدا کی جس کا اثر نہ صرف اس صنف پر دیر پا ہوا بلکہ اس سے دوسرے اصناف سخن بھی متأثر ہوئے۔

ہر بڑے اور عظیم شاعر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اسے موضوعات کے برتنے کا ہنر آتا ہو اور موضوعات کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کا خاص خیال رکھتا ہو۔ یعنی مایۂ اظہار اور پیرایۂ اظہار پر خصوصی نظر رکھتا ہو۔ اردو شاعری کی تاریخ میں چار بڑے اور عظیم شاعر گذرے ہیں۔ ۱۔ میر تقی میرؔ، ۲۔ غالبؔ، ۳۔ اقبالؔ، ۴۔ انیسؔ۔ یہ وہ شاعر ہیں جو موضوعات کو پرکھنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ منفرد لب و لہجہ کے شاعر تھے، انہیں 'لان جائی نس' کی زبان میں صاحبِ ڈکشن کہا جا سکتا ہے۔ لیکن انیسؔ اور ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ ان کے موضوعات لا محدود اور غیر متعیّن تھے اور انیسؔ کے موضوعات محدود اور متعیّن تھے۔ مگر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان محدود اور متعیّن موضوعات میں لا محدود امکانات پیدا کر دیئے۔

لان جائی نس نے کہا ہے کہ شاعری میں عظمت و ترفع پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بلند خیالات، نفیس جذبات، عمدہ قسم کی صنائع و بدائع اور الفاظ کی مناسب ترتیب و تنظیم وغیرہ ہوں۔ انیسؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کو زبان پر مکمل قدرت حاصل تھی جس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دُوں　　قطرے کو جو دُوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں　　خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھُول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں

❖

انیس الفاظ کی حرمت و عظمت سے واقف تھے۔ وہ لفظ شناس، موقع شناس اور الفاظ کے استعمال کا سلیقہ اس کی مناسب ترتیب و تنظیم کا ہنر جانتے تھے۔ جہاں انہیں زبان پر قدرت حاصل تھی وہیں ان کو بیان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کا بند پیش کیا جارہا ہے جس کی تراش و خراش اور خوبصورتی قابل ملاحظہ ہے:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے　　سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے　　زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لئے

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامے دارد[۲]

حالیؔ انیسؔ کی شاعری اور ان کے زبان و بیان کے بارے میں اپنی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں فرماتے ہیں کہ:

''میر انیسؔ نے اس طرز کو معراج کمال تک پہونچا دیا اردو شاعری میں جو کہ مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کردیا۔ بیان کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کئے ایک ایک واقعے کو سو سو طرح سے بیان کرکے قوت متخیلہ کی جولانیوں کیلئے ایک نیا میدان صاف کردیا اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جس کو ہمارے شاعروں کے قلم نے مس تک نہ کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول

۱۔ انیس کے مرثیے، جلد اول، مرتبہ صالحہ عابد حسین، صفحہ ۶۱
۲۔ انیس کے مرثیے، جلد دوم، صفحہ ۴۵۳

چال میں محدود تھا اس کو شعراء سے روشناس کرادیا۔"[۱]

جہاں ایک طرف حالیؔ نے انیسؔ کے متعلق کہا تو دوسری طرف 'احتشام حسین' نے اپنی کتاب 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"زبان، طرزِ ادا اور حقیقت نگاری کسی اعتبار سے بھی دیکھا جائے انیسؔ دنیا کے عظیم شعراء میں شمار ہوں گے ان کی شاعری میں وہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک عظیم فنکار کے لئے ضروری ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا ایسا خزانہ تھا کہ وہ ملتے جلتے جذبات اور پیچیدہ حالات کی مصوری بالکل فطری انداز میں کر سکتے تھے۔"[۲]

اردو کے زیادہ تر مرثیہ نگار شاعروں نے فطرت نگاری کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اردو میں مرثیہ نگاری کے ابتدائی دور میں مناظرِ فطرت کی عکّاسی نہیں کی جاتی تھی لیکن میر انیس ایسے شاعر ہیں جنہوں نے پہلی بار مناظر قدرت کو مرثیوں میں شامل کیا۔ اگرچہ میر انیسؔ کے یہاں بھی مناظرِ فطرت کی حیثیت ضمنی ہے۔ اصل مقصد تو واقعہ کربلا کا بیان ہے لیکن انیسؔ نے جو مناظر پیش کیے ہیں وہ حقیقت سے قریب نظر آتے ہیں۔ فطرت نگاری میں انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ واقعہ تو کربلا کا بیان کرتے ہیں لیکن جو مناظر پیش کرتے ہیں وہ ہندوستانی ہوتے ہیں، جس سے ان کی شاعری میں عمومیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

ہر بڑے شاعر کے یہاں پیکر تراشی اور منظر نگاری کے نمونے ضرور ملتے ہیں۔ مگر میر انیسؔ کے یہاں منظر نگاری ایک ایسی اہم خوبی ہے جو انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے انہوں نے مناظر قدرت کو بڑے فطری انداز میں پیش کیا ہے :

صبح کا منظر:

پھوٹی شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح — سر گرم ذکر حق ہوئے طاعت گذار صبح

۱۔ مولانا الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ ۳۰۳،۳۰۲

۲۔ سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۱۰۷

تھا چرخ اختری پہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا[1]

طے کرچکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح ہرسو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہوگیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہوگیا[2]

❖

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگِ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے[3]

میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ لفظوں کے ذریعہ ایسی تصویر کشی کرتے ہیں جیسے بڑے بڑے مصوّر رنگوں سے کر بناتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب ہم مرثیہ کو سنتے ہیں تو پورا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔انہوں نے اپنے مرثیوں میں دو طرح کے مناظر پیش کئے ہیں۔(۱) متحرک منظر (۲) جامد منظر۔ ان دونوں مناظر کو انہوں نے بڑے فطری انداز میں بڑی دلکشی کے ساتھ پیش کیا۔

❖

۱۔انیس کے مرثیے، جلد اول، مرتبہ صالحہ عابد حسین، صفحہ ۳۲۳
۲۔انیس کے مرثیے، جلد اول، صفحہ ۱۹۵
۳۔ایضاً، صفحہ ۳۱۱

صحرا کی گرمی:

آبِ رواں سے منھ نہ اٹھاتے تھے جانور جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر خس خانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جاتے راہ میں
پڑجائیں لاکھوں آبلے پائے نگاہ میں[1]

مکالمہ نگاری اچھی شاعری کی جان ہوتی ہے۔جو جتنا بڑا شاعر ہوگا اس کے مکالمے اسی طرح حقیقت سے قریب ہونگے۔اردو مرثیہ کے باب میں میر انیسؔ وہ شاعر ہیں جن کو مکالمہ نگاری پر مکمل عبور حاصل تھا۔ میر انیسؔ مکالمہ لکھتے وقت افراد کی عمر، مرتبے اور انفرادی خوبیوں کو نظر میں رکھ کر وقت اور حالات کے مطابق مکالمہ لکھتے تھے۔ میر انیسؔ نے انہیں تمام بنیادی اصولوں کے تحت مکالمے لکھے اسی لیے ناقدین نے ان کے اس فن کو اردو شاعری کی بے مثل مکالمہ نگاری قرار دیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ہر بڑی اور عظیم شاعری ڈرامہ کے قریب آجاتی ہے۔ اگر انیسؔ کی شاعری مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انیسؔ کے اندر ایک بہت بڑا ڈرامہ نگار موجود تھا جو کام شیکسپیئر وغیرہ نے نہیں کیا وہ انیسؔ نے کر دکھایا۔ کیونکہ ایک چیز ہوتی ہے دکھا کر بتانا اور ایک چیز ہوتی ہے بتا کر دکھانا۔ دکھا کر بتانا آسان ہے لیکن بتا کر دکھانا مشکل ہے۔ انیسؔ کا کمال ہے کہ انہوں نے بتا کر اس طرح دکھایا ہے کہ وہ دکھا کر بتانے سے بہتر ہو گیا ہے۔ پروفیسر فضل امام میر انیس کی مکالمہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مرثیوں سے قبل اردو کی جن اصنافِ سخن میں مکالمہ نگاری نظر آتی ہے وہ محدود رہی ہے، حسن و عشق کی کیفیات کی پیش کش غزلوں اور مثنویوں میں ملتی ہے لیکن وہ صرف ایک ہی محور پر گھومتی پھرتی رہی ہے۔ اس کو وسعت اور تنوع سب سے پہلے مرثیہ نگاروں نے عطا کیا اور انیس نے مکالمہ نگاری کو ایک گراں قدر اور مستند فن قرار دے دیا۔"[2]

۱۔ انیس کے مرثیے، جلد اول، صفحہ ۳۲۸
۲۔ فضل امام رضوی، میر انیس شخصیت و فن، ۱۸۱

سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

"گفتگو اور مکالمے کے لکھنے میں بھی کوئی شاعر انیس کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ انیس جب دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں تو الفاظ، طرز کلام اور لب و لہجے میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف، سیرت، حیثیت، وقتی قلبی کیفیت، گفتگو کے موقعے اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔"[1]

میر انیسؔ کے مرثیے کے چند بند ملاحظہ ہوں جس میں انہوں نے جناب حرؑ کا عمر سعد سے مکالمے کو قلم بند کیا ہے جو مکالمہ نگاری کی بہترین مثال ہیں:

حر سے گھبرا کے یہ بولا عمر سعد شریر — یہ تو لگتی ہے طرفداریٔ شہؑ کی تقریر
اپنے آقا کا نہ کچھ ذکر نہ تعریف امیر — اللہ اللہ یہ اوصاف اور یہ مدح شبیرؑ

سن چکا ہوں کہ تو مضطر ہے کئی راتوں سے
الفت شاہ ٹپکتی ہے تیری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں، نہ وہ چتون، نہ وہ تیور، نہ مزاج — سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج — جن کو سمجھا ہے غنی دل میں، وہ خود ہیں محتاج

کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے[2]

❖

۱۔ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، روح انیس، صفحہ ۳۷
۲۔ انیس کے مرثیے، جلد اول، صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸

اس کے جواب میں جناب حر کہتے ہے:

عمل خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس یہی کونین کے مالک ہیں یہی راِس و رئیس
کیا مجھے دے گا تیرا حاکم ملعون و خسیس کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھے پرچہ نویس

ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں[1]

❖

ارسطو یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا، جو افلاطون و سقراط کا شاگرد تھا۔ بوطیقا ارسطو کی کتاب ہے۔ بوطیقا میں ارسطو نے نقل، فطرت، شاعری کی اصل، شاعری کی اقسام، المیہ کے اصول وغیرہ پر بحث کی ہے اور شاعری کا ایک آفاقی نظریہ پیش کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اس کتاب کا "شعریات" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

ارسطو طربیہ و رزمیہ شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے بلکہ وہ المیہ شاعری کو اہم سمجھتا ہے، کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ المیہ کے مناظر سے خوف اور دردمندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے انسان کو خود احتسابی کا موقع ملتا ہے اور جتنے بھی مفسدات اور منفی قوتیں ہیں اس کا ازالہ کرتا ہے۔ المیہ مناظر کو دیکھنے اور سننے والوں پر ایک مثبت اثر ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے ایک مثال دیتا ہے کہ المیہ کا اثر بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے ایک پکا ہوا پھوڑا ہو اور جب اس پر چاقو لگے تو مواد کے باہر آنے سے جو راحت ملتی ہے وہی المیہ کے مناظر کو پیش کرنے کے بعد اثر ہوتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ المیہ مناظر تزکیہ نفس اور تنقیہ نفس کا کام کرتے ہیں جسے یونانی زبان میں "کتھارسس" کہا جاتا ہے۔

اگر ارسطو کے المیہ کے اصول پر اردو ادب کی کوئی صنف اترتی ہے تو وہ مرثیہ ہے۔ جس کے سننے اور پڑھنے سے جہاں تہذیبِ اخلاق حاصل ہوتی ہے وہیں انسان کے اندر مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مرثیہ انسان کو حق کا طرفدار اور باطل سے بیزاری عطا کرتی ہے۔

۱۔ انیس کے مرثیے، جلد اول، صفحہ ۱۸۱

مرثیہ کا تعلق رثائی ادب سے ہے جس کے ذریعہ سننے والوں کے دلوں میں سوز و گداز پیدا کرکے ان پر رقّت طاری کرنا یعنی رُلانا مقصود ہوتا ہے۔ یوں تو پورا مرثیہ ہی غم والم کی داستان کا نام ہے لیکن رخصت، شہادت اور بین وہ اجزاء ہیں جنھیں الم انگیزی کے اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اردو ادب میں میر انیسؔ وہ باکمال شاعر ہیں جنھیں جذبات نگاری پر ملکہ حاصل ہے۔ اگرچہ میر انیسؔ اپنے مرثیوں میں شہادت کا تذکرہ بہت مفصّل نہیں کرتے مگر ان کے مرثیوں کا کمال یہی ہے کہ "مختصر پڑھ کر رُلا دینے کا سامان ہے"۔

ایک بہترین مرثیے کی خصوصیات میں ذہنی و جمالیاتی تسکین، تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ سب سے اہم یہ کہ سننے والوں پر رقّت طاری ہو جائے۔ اردو مرثیوں کا یہی وہ بنیادی مقصد ہے جو اسے یونانی المیہ تمثیل کے قریب لے آتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ میر انیسؔ اپنے ایک مرثیے میں گریہ وبکا کے مفہوم اور ان کی نفسیاتی، اخلاقی اور اعتقادی قدر و منزلت پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور مرثیہ کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کی بنا پر المیہ سے اس کا موازنہ کیا جاتا ہے:

کیوں مومنو، کیا فیض ہے کیا لطف وعطا ہے　　کیا مرتبہ اشک ہے کیا اجرِ بکا ہے
گوہر ہیں یہ وہ، جن کا خریدار خدا ہے　　جو کچھ ہے سو بس دوستی آلِ عبا ہے

دنیا پہ، نہ دولت پہ توجہ ہے، نہ زر پر
زہراؑ کی نظر پڑتی ہے اشکوں کے گہر پر

کیا اشک عزادار کا رتبہ کوئی جانے　　یہ گنج گہر بخشا ہے مردم کو خدا نے
کی ہے نظر عین عنایت شہدا نے　　دکھلائیں گے کیا کیا ثمر ان اشکوں کے دانے

یاں اس کا نہ عقدہ دل مضطر پہ کھلے گا
یا قبر میں یا چشمہ محشر پہ کھلے گا

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو　　آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو　　ایذا بھی ہو مجلس میں تو راحت اسے جانو

فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمہارے لیے کیا ظلم سہے ہیں[1]

اردو مرثیے میں رخصت کا بیان المیہ شاعری کا پہلا حصہ ہے۔رخصت سے مراد مرثیے کا وہ حصہ جس میں مرثیے کا مرکزی کردار میدانِ جنگ میں جانے کے لیے اپنے عزیز واقارب سے رخصت طلب کرتا ہے۔انیسؔ چونکہ انسانی نفسیات کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے لہٰذا رخصت کے لمحات کا تذکرہ کرتے ہوئے خاندانی اور معاشرتی رشتوں کو خوب اجاگر کرتے ہیں اور ہر شخص کے جذبات واحساسات کو رشتے کی نوعیت کے اعتبار سے بیان کرتے ہیں۔جب حضرت امام حسین علیہ السلام خیام میں رخصت کے لیے آئے ہیں تو اس وقت کے منظر کو یوں بیان کیا ہے:

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلہ انام　　تر تھی لہو سے لختِ جگر کے قبا تمام
رخ زرد، دل میں درد بدن سرد تشنہ کام　　طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام

یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

پیارے نہ تھے حسین علیہ السلام کے　　لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
تھرّا رہے تھے پاؤں شہ تشنہ کام کے　　سر دوش پر تھا زینبؑ عالی مقام کے

فرماتے تھے بہن، علی اکبر گزر گئے
ہم ایسے سخت جاں تھے کہ اب تک نہ مر گئے

سر بارِ دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن　　اب عنقریب خیمہ عصمت ہیں تیغ زن
مردے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن　　پامال ہو نہ لاشہ فرزند صف شکن

۱۔انیس کے مرثیے، جلد اول، صفحہ ۷۴

مجوب ہم ہیں قاسمؑ بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبرؑ کی روح سے

یہ سچ کہ تم کو مجھ سے محبت ہے اے بہن کیا کیجے ناگزیر ،یہ فرقت ہے اے بہن
پیارے تمہارے بھائی کی رحلت ہے اے بہن دنیا مقامِ رنج و مصیبت ہے اے بہن

بھولے نہ یادِ حق کبھی گو حال غیر ہو
اس کی ظفر ہے خاتمہ جس کا بخیر ہو

دیکھا یہ کہ کے بالی سکینہؑ کو یاس سے لپٹی وہ دوڑ کے شہِ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے بولی وہ تشنہ کام شہِ حق شناس سے

کیااس بلاکے بن سے تہیہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارداہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں سفرِ ناگزیر ہے آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوئے قربِ خدائے قدیر ہے تنہا ہیں ہم سپاہِ مخالف کثیر ہے

طے ہو یہ مرحلہ جو اعانت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے[1]

❖

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے رخصت کے بعد عموماً شہادت کا بیان ہوتا ہے۔ شہادت ہی کے ضمن میں رزمیہ شاعری جیسے ہیرو کا سراپا، گھوڑے کی تعریف، تلوار کے وار کی تعریف، رجز، جنگ اور آخر میں شہادت کا بیان جو حقیقت میں المیہ ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس کی وجہ سے ارسطو کی المیہ تمثیل اور

۱۔ مرثیہ خوان جناب جعفر علی صاحب، حیدرآباد دکن

مرثیہ میں مشترک قدریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میر انیسؔ حضرت امام حسین عالی مقام کی شہادت کا جب بیان کرتے ہیں تو پورا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے:

آج شبیرؔ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے ظلم کی چاند پہ زہراؔ کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پرآب تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
شدتِ ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گذر جاتے ہیں

خون سے تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے ہے جبیں چاند سی پر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہے تیرِ بیداد سے دل زخمی، جگر زخمی ہے
ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آ کر کوئی پہلو میں لگا جاتا ہے مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخمِ بدن، زور گھٹا جاتا ہے بند آنکھیں ہیں، سرِ پاک جھکا جاتا ہے
گردِ زہراؔ و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دو جہاں گرتے ہیں

زیں سے ہوتا ہے جدا دوشِ محمد کا مکیں چمنِ فاطمہ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں ہیں سرورِ دیں ہے یہ نزدیک گرے مہرِ نبوت کا نگیں

پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علیؑ کہتی ہے زینبؑ تو سنبھل جاتے ہیں

رحم کر رحم کر شرمندہ ہوں اے یارِ خدا بندگی کا ترے جو حق تھا ادا ہو نہ سکا
خوفِ محشر سے، بدن کانپتا ہے، سرتاپا ہوگی اعمال کی پرسش تو، کہوں گا میں کیا؟

کوئی تحفہ ترے لائق نہیں پاتا ہے حسینؑ
ہاتھ خالی ترے دربار میں آتا ہے حسینؑ

ابھی مولا نے سرِ عجز اٹھایا نہ تھا آہ نیزہ اک چھاتی پہ مارا جو کسی نے ناگاہ
غش میں گرنے لگے گھوڑے سے امامِ ذیجاہ آئی خاتونِ قیامت کی صدا بسم اللہ

تھامنے آئے علیؑ خلد سے گھبرائے ہوئے
دوڑے محبوبِ خدا ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے

تیز کرتا ہوا خنجر کو گیا شہ کے قریں آسماں ہل گیا تھرا گئی مقتل کی زمیں
رو رو چلانے لگی زینبِؑ ناشادِ حزیں غش میں بھی گھیرے ہیں، ہے ہے مرے بھائی کو لعیں

رحم زہراؑ کے پسر پر نہیں کھاتا کوئی
خاک سے بھی نہیں زخمی کو اٹھاتا کوئی[1]

۱۔ انیس کے مرثیے، جلد دوم، صفحہ ۳۴۲ تا ۳۴۸

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہے غضب نکلی رکاب پائے مطہر سے ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہے غضب

قرآں رحل زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا[1]

❖

شہادت سے متصل ہی بین کا ذکر ہوتا ہے۔جو مرثیے کا آخری مگر اہم جزو ہے جس میں امام عالی مقام کی شہادت پر اہل حرم بین کرتے ہیں۔ بین ہی وہ ہے جس سے " کتھارسس" حاصل ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے بین کے بارے میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ رقم طراز ہیں:

" مرثیے کا سب سے دردناک حصّہ "بین" ہے۔بلکہ سچ پوچھیے تو بین ہی اصل مرثیہ ہے۔ میر انیسؔ بالعموم مختصر بین لکھتے ہیں۔ طولانی بین بہت کم لکھتے ہیں۔وہ سخت لکھنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے مخاطبِ صحیح عوام نہیں بلکہ لطیف جذبات کے لوگ ہیں۔ جن کے دل پر بے محل نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنی با محل ایک آہ۔ جو لوگ لطیف جذبات رکھتے ہیں ان کو سخت مظالم کے بیان سے تنفّر اور سخت بین سے تبغض ہوتا ہے۔ لیکن جہاں جہاں ان کے نازک جذبات کو ٹھیس لگتی ہے وہاں ان کے آنسو بے ساختہ نکل آتے ہیں۔ میر انیس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔انیسؔ کے یہاں بین کے علاوہ مرثیے کے دوسرے مقامات بھی اکثر دردناک اور نہایت پُراثر ہوتے ہیں۔رخصت بالخصوص ایسی ہوتی ہے کہ پتّھر کا دل پانی ہو جائے"۔[2]

امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور جناب زینبؑ کے بین کو میر انیسؔ نے کس درد و کرب کے ساتھ بیان کیا ہے:

۱۔انیس کے مرثیے، جلد دوم، صفحہ ۳۳۹
۲۔روح انیس، سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، صفحہ ۴۰

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمدا
اس وقت کون حق محبت کرے ادا ہے ہے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا

انیس سو ہیں زخم تن چاک چاک پر
زینب نکل حسین تڑپتا ہے خاک پر

پردہ الٹ کے بنتِ علی نکلی ننگے سر لرزاں قدم، خمیدہ کمر، غرق خون جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر اے کربلا بتا، ترا مہمان ہے کدھر

اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہونچا دو لاش پر مرے بازو کو تھام کے

اس وقت سب جہاں مری آنکھوں میں ہے سیاہ لوگو! خدا کے واسطے مجھ کو بتاؤ راہ
سید کدھر تڑپتا ہے اماں کدھر ہیں آہ؟ کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتل گاہ؟

شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

کس نے صدا یہ دی کہ بہن اس طرف نہ آؤ بس اب سفر قریب ہے للہ گھر میں جاؤ
اب ڈوبتی ہے آل رسولِ خدا کی ناؤ یا مرتضیٰ غریبوں کے بیڑے کو تم بچاؤ

اب چھوڑ یو نہ دشتِ بلا میں حسین کو
یا فاطمہ چھپا لو ردا میں حسین کو

بنتِ علی تو پیٹتی پھرتی تھی ننگے سر کٹتا تھا نورِ چشم علی کا گلا ادھر
زینب کو منع کرتے تھے ہر چند اہلِ شر لیکن وہ دوڑی جاتی تھی تھامے ہوئے جگر

پہونچی جو قتل گاہ میں اس روک ٹوک پر
دیکھا سرِ حسین کو نیزے کی نوک پر

نیزے کے نیچے جا کے پاری وہ سوگوار سید تری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیا چھری کی دھار بھولے بہن کو اے اسدِ حق کے یادگار

صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہے ابھی یاد آلہ میں

بھیا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو چلا رہی ہے دخترِ حیدر جواب دو
سوکھی زبان سے بہرِ پیمبر جواب دو کیونکر جئے گی زینبِ مضطر جواب دو

جز مرگ دردِ ہجر کا چارا نہیں کوئی
میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

ہے ہے تمہارے آگے نہ خواہر گذر گئی بھیا بتاؤ کیا تہ خنجر گذر گئی؟
آئی صدا نہ پوچھو جو ہم پر گذر گئی صد شکر جو گذر گئی بہتر گذر گئی

سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے
گر ہے تو بس تمہاری جدائی کا داغ ہے

گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوج نابکار کہیو نہ کچھ زباں سے، بجز شکرِ کردگار
خیمہ میں جب کہ آگ لگادیں ستم شعار رہیو مری یتیم سکینہ سے ہوشیار

بے زار ہے وہ خستہ جگر اپنی جان سے
باندھے نہ کوئی اس کا گلا ریسمان سے

بس اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند　　عالم کو یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند　　عالم پسند بند ہیں سلطان پسند بند

یہ فصل اور یہ بزمِ عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے [1]

❖

مجموعی جائزہ:

پروفیسر مسعود حسین رضوی میر انیسؔ کی فکری و فنی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”حقیقت یہ ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں انیس کے مرثیے ان سب پر حاوی ہیں شاعری جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، تخیل کی جولان گاہ ہو یا محاکات، وجدان کی تعمیر ہو یا حیات کی، ان کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکون قلب کی تحصیل یا کسی پیغام کی تبلیغ مختصر یہ کہ شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں اس کے محاسن قرار دیئے گئے ہیں اس کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں ان سب کے اعتبار سے انیسؔ کے مرثیوں کا شمار اعلیٰ درجہ کی شاعری میں ہوگا۔“ [2]

میں مسعود حسین صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہوں گا کہ حق یہی ہے کہ میر انیس کے مرثیوں کا شمار اعلیٰ درجہ کی شاعری میں ہوتا ہے، اگر ہم اردو شاعری کے صاحبِ ڈکشن شعراء کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں میرؔ کے یہاں غم کرتے ہوئے انسان کا تصور ہے۔ غالبؔ کے یہاں غور و فکر کرتے ہوئے انسان کا تصور پایا جاتا ہے۔ اقبالؔ کے یہاں انسان کامل کا تصور ہے لیکن انیسؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں ان تینوں بڑے عظیم شاعروں کے یہاں پائے جانے والے انسانی تصورات کی بیک وقت کارفرمائی ہے۔ انیسؔ کے مرثیے رزمیہ و المیہ شاعری کے شاہکار ہیں۔ انہوں نے مناظرِ فطرت کا بیان، جذبات و

۱۔ انیس کے مرثیے، جلد دوم، صفحات ۳۳۹تا۳۴۱

۲۔ انیسیات، سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۱۰۶

احساسات کی ترجمانی، کردار نگاری، واقعہ نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے ہیں۔آیات و روایات سے استفادہ کرتے ہوئے مرثیے کے فن کو بامِ عروج تک پہنچایا۔زبان و بیان میں فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، فرہنگ و محاورات کے عظیم ذخیرے سے اردو ادب کے دامن کو مالامال کیا۔

☆☆☆

منابع و مآخذ

- اردو مرثیہ، شارب ردولوی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۱ء
- ارسطو سے ایلیٹ تک، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء
- انیس شناسی، فضل امام، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۱
- انیس کے مرثیے، صالحہ عابد حسین، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء
- انیسیات، سید مسعود حسن رضوی ادیب، اترپردیش اردو اکاڈمی، لکھنو، ۱۹۸۱
- روح انیسؔ، سید مسعود حسن رضوی ادیب، انڈین پریس لیمیٹیڈ، الہ آباد
- مقدّمہ شعر و شاعری، مولانا الطاف حسین حالیؔ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
- موانہ انیس و دبیر، علّامہ شبلی نعمانی، اتّرپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء
- میر انیسؔ، حیات و شاعری، فرمان فتح پوری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۶ء
- نقوش، انیس نمبر، مدیر محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۱ء

جدید مرثیہ اور اس کی خصوصیات

مؤلف: ڈاکٹر منتظر مہدی

انیس اور دبیر یا ان کے ہم عصر اہم مرثیہ نگاروں کا معیار اور مقام اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ان کے بعد کے شعراء کے کارناموں کو بھی ان کی وسعت نگاہ اور جدت طبع کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ایک طرف جہاں انیس و دبیر کی بڑی حد تک تقلید یا ان کے قائم کردہ خانوں ہی میں رنگ بھرنے کی کوشش ہو رہی تھی اسی کے ساتھ ایک خاصی تعداد کچھ ایسے مرثیہ گو شعراء کی بھی تھی جو بدلتے ہوئے سماجی رجحانات کو محسوس کر رہے تھے اور تاریخ مرثیہ نگاری میں نئی راہوں کی تلاش میں تھے۔

مولانا حالیؔ نے اردو ادب کو ایک نئی روشنی دی تھی اور اسے گل و بلبل اور جام مینا کے مضامین اور افسانوں سے پاک کرنے کی کوشش کر کے فکر و عمل اور علم کی ترغیب دی تھی۔ جس کے سبب دوسرے اصناف کی طرح مرثیہ بھی زندگی کے عام مسائل اور رجحانات پر غور کرنے اور ان کے حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکا اور اس عام افادی اور مقصدی شاعری کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہو سکا۔ سب سے پہلے مرزا دبیر کے بیٹے مرزا اوج نے مرثیہ نگاری کو جس نئی ڈگر پر ڈالنے کی شروعات کی تھی اس روایت کو آگے بڑھانے میں بہت سے مرثیہ گو اس عہد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے۔ جن میں شاد عظیم آبادی کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ شاد کے علاوہ صفیر بلگرامی اور بعض دوسرے شعراء کے مرثیوں میں بھی اس نئی روش کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان شعراء نے اصلاحی مضامین کو مرثیہ نگاری میں تھوڑی بہت ضرور جگہ دی ہے۔

اس طرح اس دور میں بعض مرثیہ گویوں نے بدلتے ہوئے سماجی رجحانات کو سمجھا اور مرثیہ کے مستقبل کے لئے بقاء کا سامان مہیا کیا۔ نفیس، علی میاں کامل، وحید اور شمیم امروہوی نے ان رجحانات کو اپنانے کے ساتھ روایت کی پاسداری بھی برقرار رکھی۔ خاص کر شمیم امروہوی نے مرثیوں میں تاریخ و

روایت کی پیشکش میں جدت طبع کے ساتھ زبان اور بیان کا معیار بلند کیا اور عناصر مرثیہ کی پابندی بھی کی۔ ۱۸۵۷ کے بعد کے حالات کے پیش کرنے میں سرسید کی تحریک، عوام کو نظم کے بجائے نثر کی طرف راغب کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود عقیدت کے اظہار کے طور پر مرثیہ گو مرثیہ کہنے پر مائل تھے۔ ان کے مرثیوں میں دوسرے مضامین یا مسائل کے بجائے مصائب کے بیان پر زیادہ زور تھا۔ پیارے صاحب رشید نے اس صورت حال کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے کچھ ایسے مضامین پر زور دیا جو شعراء کی ذہنی آسودگی کا سبب بن سکیں۔ یعنی بہار اور ساقی نامہ پر انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ لوگوں کے ذہنوں سے افسردگی اور بے بسی کی کدورت ختم ہوئی۔ رزمیہ بیانات سے حوصلہ اور جرات ملی۔

بیسویں صدی کے اوایل میں سر سیدؔ اور حالیؔ کی کوششیں بارآور ہوئیں اور حالات نے آہستہ آہستہ رخ بدلنا شروع کیا۔ قوم میں بیداری کی لہر دوڑنا شروع ہوئی اور تعلیم کا چرچا عام ہوا جس سے نظریات تبدیل ہوئے۔ ان حالات میں دوسرے شعراء کی طرح مرثیہ نگاروں نے بھی اپنی شاعری کا رخ بدلا۔ شہنشاہیت اور ملوکیت سے نفرت اور غلامی اور جہالت کے خلاف آواز اٹھی۔ چنانچہ شعراء نے بھی ان حالات کو مرثیوں میں جگہ دینا ضروری سمجھا اور واقعہ کربلا کو محض عقیدت مندی کے ساتھ پیش کرنے کے بجائے فکر و شعور اور فلسفیانہ ڈھنگ سے پیش کیا اور روایت پر جمے رہنے کے بجائے کربلا کی ان سچائیوں کو منطقی انداز میں نمایاں کیا جانے لگا جو تحریک آزادی ہند سے ہم آہنگ ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف پروفیسر مسیح الزمان نے اس طرح کیا ہے:

> ”بیسویں صدی میں سماجی زندگی میں تغیر کے سبب فکری دنیا میں بھی آہستہ آہستہ انقلاب آنا شروع ہوا۔ اس دور میں علمی بصیرت دینی بیداری اور جذبات کا احیا ہو رہا تھا۔ ادب اور زندگی کے باہمی تعلق پر غور کیا جا رہا تھا اور موجودہ ادب سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ہمہ گیر ہو یعنی جد و جہد آزادی میں عوام کا ساتھ دے سکے۔“ [۱]

ویسے تو اوجؔ اور ان کے بعد شادؔ نے مرثیہ میں جدت لانے کی کوشش کی تھی لیکن اس رنگ کو پوری طرح اپنایا نہ جا سکا اس لئے کہ اس زمانہ میں عوام کا ذہن اس طرز جدید کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا

۱۔ وحید الحسن ہاشمی، عظمت انسان مع مقدمات، ص ۳۲

پھر بھی وہ زمانہ جسے دور جدید کا آغاز کہا جاتا ہے اس میں جدید مرثیہ کے خد و خال ابھرنے لگے تھے۔ اس تبدیلی اور رجحان کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی لکھتے ہیں:

> ''جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے ولولہ انگیز مرثیوں سے انقلاب اور تحریک آزادی کا کام لیا اور سیاسی موضوعات نظم کیے۔ آل رضاؔ نے واقعات کو فلسفیانہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جمیلؔ مظہری نے مرثیوں سے قوم کی اصلاح اور بیداری کا کام لیا۔ نجمؔ آفندی نے واقعہ کربلا اور ذکر حسینؑ کی ہمہ گیری کا اعلان کیا۔ نسیمؔ امروہوی نے عام مسائل کے ساتھ ساتھ مصائب کے بیان میں سوز و گداز کا معیار باقی رکھا۔ ان شعراء نے مرثیہ میں پیغام عمل اور پیام بیداری کو خصوصی طور پر جگہ دے کر انسانی فکر و احساس کو نئی روشنی دی جس کے سبب مرثیہ اپنے دور کے معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہوا۔ زندگی کے عام مسائل پر فلسفیانہ طرز فکر کے ساتھ حسینی کرداروں اور واقعات کربلا کے پس منظر میں اس دور کا مرثیہ کچھ نئی اور اہم جہات سے روشناس ہوا۔''[1]

اس موقع پر یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ اسی زمانے میں آزادؔ، شبلیؔ اور حالیؔ نے مرثیہ نگاری کو بحیثیت فن تسلیم کیا اور اسے تنقید میں شامل کیا اور مرثیہ کو سب سے زیادہ اہم اور پاکیزہ صنف قرار دیا۔

مرثیہ کا یہ ارتقاء بہت سے ایسے اسباب کا نتیجہ ہے جو ہر فن کی ترقی میں پیش آتے ہیں۔ مرثیہ کا ابتدائی زمانہ محض اظہار تاثر اور عقیدت تک ہی محدود تھا۔ زبان و بیان کا استعمال نہ تو فن کارانہ تھا اور نہ شعراء کے سامنے مرثیوں کے اعلیٰ نمونے تھے اور نہ اردو شاعری منزل ارتقا تک ہی پہونچی تھی۔ اسی لئے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کے بنیادی عناصر یعنی اظہار عقیدت اور اظہار مصائب کو ہی مرکزی جگہ دی اور اپنے تصورات کو توانائی بخشی۔

ہر دور میں مرثیہ کا اصل مقصد وصف میت بیان کرنا اور اظہار رنج والم ہی رہا ہے۔ مرثیہ نگاروں نے خاص کر دور تعمیر و تشکیل کے مرثیہ گویوں نے مرثیہ کی غیر معین ہیئت سے فائدہ اٹھا کر آزادیٔ بیان کے مظاہرے کیے اور واقعہ کربلا کے روح فرسا واقعہ کو مرکزی حیثیت دے کر دوسرے مضامین مثلاً سراپا، منظر،

۱۔ طاہر حسین کاظمی، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، ص ۱۰۵

رزم، تلوار اور گھوڑے کی تعریف جیسے مرقعوں کو مرثیہ میں شامل کیا۔ جس سے انہیں نہ اپنے مقصد سے انحراف کرنا پڑا اور نہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا گلا گھوٹنا پڑا۔ جدید فن مرثیہ نگاری کا طرز تخاطب، اسلوب اور آہنگ انیس و دبیر اور ان کے ہم عصر شعراء کے مرثیوں سے کچھ شعبوں میں یکسانیت کے باوجود الگ ہے۔ اس لئے کہ عہد حاضر جسے ہم دور جدید کہتے ہیں، کے تجربات و معاملات، مسائل و تقاضے ان کے اپنے دور کے مزاج اور رجحان کے مطابق ہیں۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں:

> ''بین الاقوامی حالات اور نئی تعلیم نے دماغوں میں مذہب اور عقل کی کشمکش تیز کر دی۔ پرانے عقائد اور تصورات کے سر بہ فلک محل ایک کے بعد ایک کر کے زمین بوس ہوتے جا رہے ہیں۔ نئے دور کے ثقافتی تقاضے مذہب پر کاری ضربیں عائد کر رہے ہیں، مذہب سے خلوص عقیدت کی جگہ ذہنوں میں تشکیک کے عناصر ابھر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں مرثیہ گو بھی اپنا انداز بیان بدلنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج کے مرثیہ گو امام حسینؑ کو بین الاقوامی رہنما کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جو جہاد و عمل اور قربانی کے سہارے دنیا کے بگڑتے ہوئے حالات کی اصلاح کر سکتا ہے۔ آج کے شاعر کے نزدیک حسینؑ، روحانیت کے پیکر اتم نہیں انسانیت کاملہ کا نتیجہ ہیں۔''[۱]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے اس خیال کی تائید پروفیسر یوسف جمال انصاری صاحب نے یوں کی ہے:

> ''آج کا مرثیہ ایک حد تک ملّی بھی ہے اور مذہبی بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں امام عالی مقام اور اہلبیت انصار کی یادیں وابستہ ہیں وہیں یہ کوشش بھی شاعر کے پیش نظر رہتی ہے کہ اس کا ایک بڑا فرض اس پیغام کو عوام تک پہونچانا ہے جو واقعہ کربلا سے ہمیں ملتا ہے۔ یہ دور تشکیک اور جمود کا دور ہے۔''[۲]

حقیقت یہ ہے کہ آج کا مرثیہ گو بالکل سیدھے سادھے انداز میں واقعات کربلا کی روشنی میں سرفروشان اور مجاہدین اسلام کے کارناموں کے آئینہ میں عام انسانی صفات یا اس میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو

۱۔ ذاکر حسین فاروقی، دبستان دبیر، ص ۸۷

۲۔ وحید الحسن ہاشمی، عظمت انسان مع مقدمات، ص ۷۹

اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ اس کی اس فکر اور کوشش میں کربلا کے ان برگزیدہ شخصیات کا روحانی وقار و مرتبہ ضمنی طور پر نمونہ بنتا ہے جس سے موجودہ دور کے سیاسی اور معاشرتی تقاضوں کی گتھیاں عقل و فہم کی روشنی میں کھلنے لگتی ہیں۔ اصلاحی اور تعمیری تحریکات کو بڑھاوا ملتا ہے لیکن کربلا کے مختلف کرداروں کی سیرت اور ان کا طرز حیات اور عمل باقاعدہ روز مرہ کی زندگی کے پیرائے میں قاری یا سامع کے سامنے نہیں آتا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا تجزیہ جدید مرثیہ کے محرکات اور قدیم مرثیہ کی روایت سے انحراف کو واضح کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''جدید دور، مذہب اور عقل و فکر میں ایک خاص قسم کے التزام اور ہم آہنگی کا متقاضی ہے جس کے سبب سیرت نگاری یا واقعات کربلا کے تسلسل سے بیان کا موقع شاعر کو نہیں ملتا اور وہ مذہبی پند و نصائح اور اس کی تعلیم و تربیت کو عقل و خرد کی کسوٹی پر کس کر سائنٹفک اور فلاسفک انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جس کی ذمہ داری صرف مرثیہ گو ہی پر نہیں عاید ہوتی بلکہ سامع کی عدیم الفرصتی طرز فکر اور طرز معاشرت بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ طول طویل داستانی اور حکایتی انداز کے ادب اور شاعری کا متحمل ہوسکے۔ یہ اثر ہمیں مرثیہ کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی نظر آتا ہے۔ خواہ نظم ہو یا نثر ہر چیز اختصار کی طرف مایل ہے۔ جدید دور کے مرثیہ میں ایجاز اور اختصار کے پیش نظر فکر و فلسفہ اور اخلاقی مضامین کو عام انسانی سطح پر لاکر مذہب کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے جس سے مرثیہ پر اس قسم کے اعتراضات کی بھی نفی ہوتی ہے کہ مراثی میں مذہب و اخلاق پر فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز میں بحث کرنے کے بجائے اس کی طوالت پسند واقعہ نگاری پر توجہ دی گئی ہے۔''[۱]

واقعات کربلا میں انسانی زندگی کے تمام تر گوشوں، مراتب و مراحل سن و شعور وغیرہ کے لحاظ سے روشنی ملتی ہے۔ جس میں تہذیب، آداب و اطوار، انقلاب و انتشار کے امکانات کے اعتبار سے ہر دور کے انسان، قوم یا فرد کو فیض پہونچانے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مرثیہ نگاروں نے

۱۔ ذاکر حسین فاروقی، اردو مرثیہ میر انیسؔ کے بعد، ص ۱۰۶

مرثیہ سے وہی کام لینا شروع کیا جس کا یہ واقعہ متحمل ہو سکتا تھا۔ اسی طرح مرثیہ نگاروں نے اپنے وقت و دور کے لحاظ سے موجودہ رجحانات اور مسائل اور تقاضوں کو اپنے مرثیہ میں داخل کر لیا۔ کربلا کا واقعہ ایک زبردست واقعہ ہے۔ ہر بڑا واقعہ کسی بھی قوم، ملک یا سرزمین یا کسی خاص وقت میں رونما ہوتا ہے۔ اس میں یہ خاص وصف ہوتا ہے کہ اس میں آفاقیت اور ابدیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

اگر اعتدال پسندی کو پیش نظر رکھا جائے تو کوئی بھی نظم قدیم یا جدید اگر بہ شکل مسدس ہو اور اس میں ائمہ معصومینؑ، ان کے رفقاء اور مصائب آل اطہار علامتی طور یا بیانیہ انداز میں ہوں اور عناصر مرثیہ کی پابندی جزوی طور پر یا پوری طور پر کی گئی ہو مرثیہ کہلانے کی مستحق ہے۔ شاعری ایک تخلیقی عمل ہے جس میں شاعر اپنے دور کے اجتماعی شعور یا وجدان اور رجحانات کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے۔ اگر بفرض محال وہ ان سے دامن بچانا بھی چاہے تب بھی یہ عوامل کسی نہ کسی شکل میں اس کے ذہن میں کارفرما ہوتے ہیں جس کا پرتو اس کی تحریر یا شاعری میں جھلکتا ہے۔

اور یہ معجزہ ہے حسینؑ اور حسینی کرداروں کے تذکرے کا کہ وہ ہر دور کے رجحانات اور ضروریات کے مطابق انسانی شخصیات کی بالیدگی اور امکانات کے سبھی پہلوؤں پر محیط ہوتا ہے۔ جہاں تک میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ اور دیگر بڑے شعراء کے مرثیوں کا تعلق ہے نہ اس طرز مرثیہ گوئی کی کوئی برابری کر سکا ہے اور نہ شاید آئندہ ممکن ہو لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ جدید مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کو جس نئی راہ سے گذارا اس کی بھی اہمیت اپنی جگہ پر لازوال ہے اور جدید مرثیہ نگاروں کی مصلحت بینی، دور اندیشی اور حالات کی نبض شناسی کی ہی وجہ سے انہوں نے مرثیہ کو خیالی دنیا سے نکال کر عملی زندگی سے جوڑ دیا ہے۔

اس تحریک جدید کے علمبرداروں میں جوشؔ کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے عناصر مرثیہ کی پابندی کو لازم نہیں رکھا اور مرثیہ کو نئی طرز اور سمت سے روشناس کرایا۔ جوش کے علاوہ دوسرے کئی شعراء ایسے ہیں جنہوں نے روایت کی پابندی کو بھی ملحوظ رکھا اور دور جدید میں بھی طبع آزمائی کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ مثلاً فراستؔ زیدپوری، قمرؔ جلالوی، خبیرؔ لکھنوی، فائزؔ، مودبؔ، مہذبؔ وغیرہ یہ لوگ فکر کے اعتبار سے تو دور جدید میں ہیں لیکن فن کے لحاظ سے قدیم ہیں جب کہ موضوعات اور فنی تقاضوں کے پیش

نظر مرثیہ کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرانے کا سہرا اوجؔ اور شادؔ کے بعد جوشؔ ملیح آبادی اور جمیلؔ مظہری کے سر جاتا ہے۔

جدید مرثیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جدید مرثیہ نگاروں نے ان اجزائے ترکیبی کو تو بالکل کالعدم ٹھہرایا جو قدیم مرثیہ کا خصوصی اور اہم ترین جزو تھے۔ زمانہ کے حالات اور ذہنی پس منظر میں تبدیلی کے ساتھ تلوار اور گھوڑے کی تعریف کب تک ہوتی رہتی اور نیز یہ کہ اس بیان میں انیسؔ و دبیرؔ کا مقابلہ امر محال تھا۔ چنانچہ بعد میں آنے والوں نے اپنے لئے نئی نئی راہیں تلاش کیں۔

جوشؔ، جمیلؔ مظہری، نجمؔ آفندی، آلؔ رضا، نسیمؔ امروہوی وغیرہ نے اوجؔ کے انداز کی بڑی حد تک تقلید کی اور مرثیہ کے ابتدائی حصے میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف کے بجائے اپنے دور کے مسائل، معاشرے اور تہذیبی اذکار کو ضروری جانا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی اور اہم تحریک آزادی جو ملک کو بچانے کی تحریک تھی شعراء نے اس کا ذکر کیا اور ایک زندہ اور بیدار ذہن کے انسانی فرائض اور دوسرے سماجی مسائل کو مرثیوں میں جگہ دی۔ انیسؔ کے مرثیے انیسؔ کے دور کی جدید تخلیق تھے لیکن ان میں وہ بات نہیں ہے جسے آج جدید کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے اس زمانہ میں آج کے دور کی زندگی کے مسائل نہیں تھے۔ انیسؔ کے یہاں جاگیردارانہ نظام اور تہذیب کی جھلک ہے۔ آج دوسرا نظام ہے۔ آج کے ادب میں مارکسی، نفسیاتی اور جنسی تنقید کے اثرات نمایاں ہیں۔

مرثیہ میں مقصدیت اور افادیت کو عام سطح پر لا کر پیش کرنے کی سہولت ہے۔ مرثیہ کی اس صفت سے فائدہ اٹھا کر جدید شعراء نے عوام میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لئے واقعات کربلا کا سہارا لیا۔ سرسیدؔ کی تحریک اور حالیؔ کے اقدام سے اردو نثر و نظم میں تبدیلی آئی اور ایک نیا طرز بیان سامنے آیا۔ اس سے صنف مرثیہ بھی متاثر ہوئی اور مرثیہ میں گل و بلبل اور ساقی نامہ کے بجائے وضاحت اور تائید پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ آیات قرآنی اور احادیث کا سہارا لیا جانے لگا۔ پیش کش میں فرق ضرور نظر آتا ہے زندگی اور وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے اب مرثیہ سے مراد صرف گریہ و بکا اور بیان مصائب ہی نہیں رہ گیا تھا بلکہ ذہنی سطح پر قاری اور سامع دونوں کو براہ راست متاثر کرنا مرثیہ کا مقصد بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ تبلیغ اور خطابت ان کے معاصر اور ان کے بعد کے شعراء کے یہاں نظر آتی ہے لیکن مرثیہ کے ذریعے ان کا بھی مقصد تزکیۂ نفس ہے اور یہ کہ واقعہ کربلا کے آئینہ میں تطہیر ذات، ایثار و قربانی کے جذبہ کو بیدار کرنا ان مرثیہ

گویوں کا مقصد رہا ہے لیکن یہ انداز شعوری طور پر ان کے یہاں نہیں جس طرح جدید شعراء پیش کرتے ہیں۔ جدید شعراء کا مقصد عالم انسانیت کو خواب گراں سے جگانا ہے۔ ان کا یہ پیغام کسی خاص فرقے یا عقیدت تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر درد مند دل اور حساس ذہن کے لیے پیغام ہے جس میں نام حسینؑ علامت خیر اور یزید کا نام شر و بدی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

جدید مرثیہ اچھائی، برائی، کفر و ایمان، صبر و جبر، راست روی اور گمرہی، حریت و استبداد، مظلومی اور قربانی وغیرہ کی علامتی پیش کش سے انسان کو امن و آشتی اور حق پرستی کا درس دیتا ہے۔ اس اعتبار سے آج کا مرثیہ ملی حیثیت کے ساتھ ساتھ مذہب اور انسانی فطرت کی بلندی اور عظمت کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ آج کا مرثیہ نگار چند واقعات اور محدود جذبات کی عکاسی کے ذکر تک ہی محصور نہیں رہتا بلکہ آزادانہ طور پر کھلی فضاؤں میں بات کہنے والا فنکار ہے۔

جدید مرثیہ میں کوئی نہ کوئی افادی پہلو یا مقصدیت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے سامنے نام و نمائش کا جذبہ نہیں رہتا جو قدماء کے دور میں رہا ہے۔ قدیم مرثیہ نگار روایات و واقعات کو بیان کرکے داد سخن پاتا اور کربلا کے کرداروں کے اوصاف و مصائب اور شہادت کی مقصدیت کو بیان کو ہی مآل مجلس سمجھتا تھا۔ آج کے مرثیہ کا افق وسیع ہے جدید مرثیہ نگاروں نے دین اسلام سے فداکاری کے ساتھ دین انسانیت اخذ کیا ہے۔ اس کی نگاہ میں حسینؑ اور کربلا کے دوسرے کردار (اصحاب حسینؑ) نہ صرف محسن اسلام ہیں بلکہ محسن انسانیت بھی ہیں۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے کردار مرثیہ کے توسل سے عام طور سے علامتی طور پر بیان کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ حسینؑ دنیائے ادب میں رنج عظیم کی علامت بن گئے ہیں اور مرثیہ گو اس علامت کے ذریعہ انسان میں حق و راستی، صداقت و شجاعت، ایثار و محبت کی روح پھونکتا ہے۔

جدید مرثیہ میں رونا رُلانا، بے بسی، بے چارگی اور مصیبت زدگی کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ آنسو مرد مجاہد، جرات مند انسان اور مرد شجاع کے آنسو ہیں جو عین تقاضائے بشریت اور فطرت ہیں۔ یہ آنسو کفر و الحاد کے خلاف جہاد اور نبرد آزما ہونے کے جذبے کو ابھارتے ہیں۔ کسی ہیرو کی میدان جنگ میں آمد۔ میدان جنگ کا ہمہمہ اور غم و الم کی فضا کا جدید مرثیوں میں لحاظ ضرور رکھا گیا ہے۔ حرب و ضرب کا ذکر، جنگ کا بیان، تلوار اور گھوڑے کی تعریف وغیرہ کو باقی رکھنے کی کوشش بھی ہے اور ان سب کے ساتھ مرثیہ اور واقعات کربلا کے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے ٹکراؤ اور بے چینی کے مناظر حق و صداقت کی خاطر مصائب

برداشت کرنا اور انسان کے ظاہر و باطن کے تصادم کی لائق قدر تصویریں پیش کی ہیں۔ جدید مرثیہ کے کردار بتاتے ہیں کہ راہ حق میں ڈٹ کر تحفظ دین و ایمان اور اپنے جگر پاروں کی شہادت گوارہ کر لینا کربلا کا تعمیری اور بنیادی مقصد ہے۔ مثلاً:

کیسے معصوم تھے معصوم گھرانے والے — مرتبہ دین محمدؐ کا بچانے والے
پاس جو کچھ تھا وہ مذہب پہ لٹانے والے — جان دے دے کے شریعت کو بچانے والے
دین سمجھا کیے اس خدمت ایمانی کو — بچے پالے گئے اسلام پہ قربانی کو[1]

❖

مختصر جائزہ کے لیے آل رضا کے یہ بند ملاحظہ کیجئے۔ انہوں نے قدیم مرثیہ کی عظمتوں کے احترام کے ساتھ جدید دور کے تقاضوں کے تحت مرثیہ کے کیا لوازم ہیں ان پر بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

سکھا گئے ہیں وہ تنظیم مرثیہ کا شعور — نہ یہ کہ کر گئے ہر جوڑ بند پر مجبور
چلا کرے گا کہاں تک یہ محترم دستور — وہی کہو جو وہ کہتے تھے ورنہ بزم سے دور
یہ مجلسوں کا تبرک ہے بے شمار بٹے — جو ایک بار بٹا ہے وہ بار بار بٹے
ہر اک زمانے میں اجزائے مرثیہ بدلے — تھے ایک دور ہی میں مرثیوں کے رنگ نئے
کہو ضرور کہو جو بزرگ کہتے تھے — مگر کچھ اپنی طرف سے بھی خاص بات رہے
کلام غیر کو اپنا لیا تو کیا حاصل — ادل بدل کے وہی رکھ دیا تو کیا حاصل[2]

انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے میں علامت نگاری کا وہ انداز نہیں تھا جو آج ہے۔ قدیم مرثیہ گویوں کے یہاں حسینؑ سے مراد حسینؑ ابن علیؑ ہی تھے لیکن آج کا مرثیہ گو لفظ حسینؑ کے کردار کے پس منظر میں کسی بھی مظلوم و بے کس اور مرد حق پرست کو مراد لے سکتا ہے۔ مثلاً

مسلم حبیب جون زہیر ابن قین تھے — اک انجمن میں آج بہتر حسینؑ تھے

۱۔ سید آلِ رضا، مراثی رضاؔ، ص ۳۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۴

یہاں حسینؑ کسی مخصوص شخصیت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک علامت ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے میں یہ علامتی انداز نہیں تھا۔ اسی طرح آج کا شاعر پیاس کو صرف ہونٹوں کے لیے نہیں بلکہ زندگی کی عام محرومی کی علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

اقبالؔ کے یہاں بھی علامت نگاری کا یہ انداز نظر آتا ہے۔ کربلا، فرات، تشنگی، حسینؑ و یزید غرضکہ سب کچھ اقبالؔ نے علامت کے طور پر نام لیے ہیں۔ اقبال کے بعد ان الفاظ کے مفاہیم وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ کربلا کسی خاص طرز سیاست کا علم بردار یا مبلغ نہیں ہے اس کا مقصد صرف حق و صداقت کی حمایت، اسلام کی پاسداری اور بقا و بہبود ہے۔ جدید مرثیہ کا یہ وصف خاص ہے کہ اس نے طرفداری اسلام کی خاطر کہیں کہیں خطیبانہ انداز بھی اپنایا ہے۔ یہی وجہ ہے مرثیہ کی مقبولیت اور افادیت دوسرے اصناف سخن کی طرح باقی ہے۔ مایوسی اور بے چارگی جدید مرثیہ کے موضوع سے خارج ہیں۔ قدیم مرثیہ گویوں کی طرح جدید مرثیہ نگار نے مقامی رنگ اور ہندوستانی تہذیب کی جھلک دکھانے میں مناسب ہندی الفاظ کا استعمال روا رکھا ہے جو اپنی فوقیت دکھانے کے لیے نہیں بلکہ ضرورت کے تحت ہے۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی:

> ''اصول ترتیب و تخلیق بعد میں وضع کیے جاتے ہیں۔ پہلے لفظ وجود میں آتا ہے، لغت میں بعد میں جگہ پاتا ہے۔ جدید مرثیہ گو نے مرثیہ کے کسی خاص موضوع یا انداز بیان کی سختی سے پابندی نہیں کی پھر بھی اپنے اپنے انداز اور الفاظ میں ہر پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔ نتیجتاً فنی فکری اور معنوی حیثیت سے علامت نگاری کے ذریعے مرثیہ کی زبان کو وسعت اور گہرائی حاصل ہوئی ہے۔''[۱]

قدیم اور جدید مرثیوں میں فضائل اور مصائب ایک ہیں لیکن بیان کرنے کا انداز الگ ہے۔ جدید مرثیہ میں مختلف موضوعات کی فلسفیانہ توجیہ پیش کی گئی ہے۔ ان مرثیوں میں منافقت کی جا بجا مذمت کی گئی ہے۔ ۶۱ ہجری میں حق و صداقت کو صرف ایک یزید سے سامنا تھا، آج قدم قدم پر یزیدیت سامنے ہے۔ پھر بھی اس سے ٹکرانے کے لیے کوئی حسین نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ''لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابن علیؑ ہو'' اس کی وضاحت جدید مرثیوں میں نئے اسلوب نئی زبان نئی طرز فکر سے ملتی ہے۔

۱۔ اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، ص ۱۳۰

مثال کے طور پر دیکھئے جدید مرثیہ نگار نے حسینیت اور یزیدیت یعنی حقیقی اسلام اور بناوٹی اسلام میں کس خوبی سے حد فاصل قائم کی ہے:

منتظر وقت کو تھا ایسے ہی اسلام سے کام ارتقاء دونوں نظریوں کا ہوا طشت از بام
ایک اسلام سے منسوب حکومت کا نظام دوسرا مورد آلام حقیقی اسلام
ایک سر چڑھ کے یزید اموی میں بولا دوسرا بس کے حسینؑ ابن علیؑ میں بولا

❖

جدید مرثیہ نگار کی ادبی اہمیت اس کے قومی اور ملی، سیاسی اور معاشرتی شعور کی وجہ سے ہے، نسیمؔ کا یہ بند دیکھئے:

تھر تھراتے ہیں قدامت کے فلک بوس محل گھر کے آئے ہیں تجدد کے بھیانک بادل
سنبھل اے رہرو گم گشتہ ایام سنبھل ہر قدم اک نئی آفت ہے ذرا دیکھ کے چل
چھپ کے بیٹھا ہے تیری گھات میں دشمن تیرا کہیں کانٹوں میں الجھ جائے نہ دامن تیرا[۱]

یہ اشارہ سرف مسلمانوں کو فعال اور سر گرم عمل بنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر فرد کے لیے ایک ذہنی بیداری کی کوشش ہے۔ اسی طرح جمیلؔ کے مرثیوں میں ترقی پسند تحریک کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں قوم کو مصروف بکا کرنے کے بجائے انہیں جگانے کا جذبہ اور تصور ان کی فلسفیانہ فکر و سیاسی بصیرت اور تاریخی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ جمیلؔ نے اپنے افکار کے ذریعے عزت نفس، شرافت اور اصول پسندی سے ملوکیت کے خلاف کمر بستہ رہنے کی ترغیب دی ہے اور اس کے مقصد اصلی کی جانب یوں اشارہ کرتے ہیں :

زندگی ان کی جو ہوں صاحب احساس و شعور صادق القول وفادار اولوالعزم غیور

۱۔ مراثی نسیم، جلد دوم، صفحہ ۹۱،۹۰

غازی و صف شکن و معرکہ گیر و منصور اپنی ہمت کے دھنی اپنے ارادوں کے غیور
اپنی ٹھوکر پہ رکھیں افسر شاہی ایسے قسمت اس قوم کی جس میں ہوں سپاہی ایسے[1]

❖

اسی طرح جوش نے تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیت سے نئی نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال کرکے موجودہ دور میں پیدا شدہ خلفشار، بدامنی، سرمایہ داری اور امارت پرستی کے خلاف آواز بلند کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ جوشؔ نے حضرت امام حسینؑ کے کارناموں اور فلسفہ انقلاب کی مثالیں دے کر ان کو جوش دلایا ہے:

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفۂ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہریار پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دوچار
اے زندگی جلال شہ مشرقین دے اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسینؑ دے[2]

❖

غرض کہ جدید مرثیہ نگاروں کی یہ طرز ادا زبان و بیان اور رنگ و آہنگ روایتی مرثیہ سے میل نہیں کھاتا بلکہ ایک انوکھی اور نرالی کیفیت اور تاثر رکھتا ہے۔ تھوڑے ہی بندوں میں پوری تاریخ کا مزہ آتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے کیف و کم کے اعتبار سے ایک ڈرامائی حسن پیدا کرتا ہے۔ طرز فکر اور طرز ادا کے اعتبار سے کربلا کے رزمیہ پہلو کے مقابلے میں اس کے فکری و اخلاقی اور درسی پہلو کو ابھارنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم مرثیہ نگار نے حضرت امامؑ کو امام کی حیثیت سے پیش کیا ہے لیکن جدید مرثیہ نگار انہیں کامل انسان کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اس کی نظر میں حسین محسن اسلام ہونے کے علاوہ محسن انسانیت ہیں۔ اسی لئے جدید مرثیہ نگار فکر و فلسفہ کے ساتھ منطقی بحث کرکے امام عالی مقام کو عام انسانی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل قرار دیتا ہے۔ کربلا کی آفاقی اور کائناتی حیثیت کیا ہے اور اس کی ہمہ گیری کے کیا اسباب ہیں؟ اس قسم کے علمی اور فکری مباحث جدید مرثیہ کے خاص اوصاف ہیں۔ جس طرح زندگی متحرک ہے اور ہر آن تغیر پسند ہے اسی طرح

۱۔ ہلال نقوی، جمیل مظہری کے مرثیے، ص ۲۴
۲۔ جوشؔ، یاد و نغمات، ص ۱۹۶

اس کے خلق کردہ ادب کا معیار بھی متحرک ہے۔ اس طرز فکر اور اسلوب موجود وقت کی ضرورت کے مطابق نئے نئے رخ اور انداز اپناتا رہا ہے اس جدید انداز فکر میں تاریخی شعور کے ساتھ فلسفیانہ اور منطقانہ استدلال کے ساتھ عقیدت مندی اور ادبی شان بھی ہے۔

دور جدید میں مرثیہ نگاروں کی ایک قابل قدر تعداد سامنے آئی ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی لکھتے ہیں:

"تقسیم کے بعد شعراء بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ہندوستان کو جو حصہ ملا اس میں جمیلؔ مظہری، نجم آفندی، زائرؔ سیتاپوری اور اولاد حسین شاعر تھے اور پاکستان کے حصے میں جو جدید مرثیہ گو آئے ان میں جوشؔ ملیح آبادی، نسیمؔ امروہوی اور سید آلؔ رضا جیسے نام شامل ہیں۔"[۱]

ضمیر اختر نقوی نے جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے بھی ایک مرثیہ کا ذکر کیا ہے جو جدید رنگ میں ہے۔[۲]

ضمیر اختر کے ہی خیال کا اعادہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے بھی بس اسی قدر کیا ہے۔ اثرؔ کا مذکورہ مرثیہ غالباً غیر مطبوعہ ہونے کی بنا پر دستیاب نہیں ہے۔ باوجود کوشش بسیار کے اس کا پتہ نہیں لگ سکا اس لئے اس قدر لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ضمیر اختر نے ان مرثیہ گویوں کے نام بھی لیے جن کا مرثیہ دور جدید میں روایتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ ہیں بابو صاحب، فائق، لڈن صاحب، فائز، خبیر لکھنوی، مہذب لکھنوی۔ ان کے علاوہ آشفتہ لکھنوی میر مانوس، فرزند حسن جلیلؔ، رفیع ذاکر اور سلطان صاحب مزید مختصر یہ کہ جدید مرثیہ تاریخ کے اوراق پارینہ اور اپنے طرز کہن سے جدید رنگ میں کہنے والے شعراء کے فکر و نظر کی بناء پر طرز کہن یعنی محض اظہار عقیدت اور اسباب گریہ فراہم کرنا اور اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کو ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ کے روپ میں زیادہ تر دیکھا گیا ہے۔ حالانکہ حسینؑ نام ہے ایک عزم کا ایک حوصلہ کا جسے بعد کے مرثیہ نگاروں نے اپنے فکر و شعور حسینؑ ناخدائے انسانیت ایمان و آشتی، قربانی، شجاعت، حریت، راست روی کا پیکر بلکہ علامت کے طور پر پیش کیا ہے چنانچہ امن و آشتی خیر و حق پرستی

۱۔ ہلال نقوی، مرثیۂ عظیم، ص ۱۲

۲۔ ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، ص ۹۹

کا درس لیتا ہے اس لحاظ سے ملی حیثیت کے ساتھ مذہب اور انسانی فطرت کی بلندی اور عظمت کی ضمانت بھی دیتا ہے۔

جدید مرثیہ کی خصوصیات کو اگر فرداً فرداً بیان کیا جاتا تو صفحات کی کمی اس طوالت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا مجموعی اعتبار سے جدید مرثیہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

☆☆☆

منابع و مآخذ

- جوشؔ، یاد و نغمات، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۴۱ء
- ذاکر حسین فاروقی، دبستان دبیر، الواعظ صفدر پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۴
- سید آلِ رضا، مراثی رضاؔ، خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر، کراچی
- ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، ۱۹۸۲ء
- طاہر حسین کاظمی، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، ایرانین آرٹ پرنٹرس دہلی، ۱۹۹۷ء
- مرثیۂ عظیم۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، دانیال اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۰ء
- ہلال نقوی، جمیل مظہری کے مرثیے
- وحید الحسن ہاشمی، عظمت انسان مع مقدمات، تعلیمی پریس لاہور، ۱۹۶۷ء

Advisory Board

Prof. S.M. Azizuddin Husain,Prof. Akhtarul Wasey,Prof. Syed Ali Mohd Naqvi

Editorial Board

Prof. Syed Akhtar Mahdi Rizvi, Dr. Haider Reza Zabit, Dr. Ali Reza Qazveh

Chief Editor

Dr. Mohd Ali Rabbani

Editor

Prof. Syeda Bilqis Fatema Husaini

Joint Editor

Dr. Khan Mohd Sadiq Jaunpuri

ISSN : 2349-0950
Printed at: Alpha Art, Noida, U.P.

Iran Culture House-18 Tilak Marg- New Delhi-110001
Phone No: 23383232, 33, and 34؛ Fax: 23387547
ichdelhi@gmail.com؛ newdelhi.icro.ir

RAH-E-ISLAM

An Urdu Quarterly Research Journal
of
Islamic and Cultural Studies

NO : 251
September-December 2020

Iran Culture House
18 Tilak Marg
New Delhi-110001